جلد ۸۵ مئی ۱۹۷۶ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

سید ابوالاعلیٰ مودودی

کی
اوّلین تصنیف

الجہاد فی الاسلام

- ☆ جو کہ ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی۔
- ☆ جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی
- ☆ جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔
- ☆ اسلام کے نظریۂ جہاد اور قانونِ صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔
- ☆ دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات۔

اور

- ☆ بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ۔
- ☆ اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل۔
- ☆ جہاد کے مخالفین و معترضین کا مسکت جواب۔
- ☆ درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

چھ سو صفحات — قیمت: ۲۳/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	مئی ۱۹۷۶ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۹۶ھ	جلد ۸۵

اشارات:-

	عبدالحمید صدیقی	۲
دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے قریش کی تدبیریں (۴)	ابوالاعلیٰ مودودی	۹

مقالات:-

اتمامِ نعمت (۲)	سید ریاض الحسن صاحب ایڈووکیٹ	۲۰
داعیٔ حق کی اخلاقی تربیت کا معیار	سید اسعد گیلانی صاحب	۳۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵- اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر: ــــ ۴۱۱۰۱۶ ــــ ۴۱۱۰۱۷

زرِسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

قرآن مجید نے کسی فرد یا قوم کی حرماں نصیبی کے جو مختلف مناظر کھینچے ہیں ان میں ایک دردانگیز منظر اُس بدنصیب بڑھیا کا ہے جو مشقت اُٹھا کر سوت کاتتی ہے اور پھر خود ہی اُسے تار تار کر دیتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی شخص جس کے ہوش وحواس قائم ہوں اور جسے اپنے مفادات بھی عزیز ہوں ایسی تخریب پسندانہ حرکت کا ارتکاب نہیں کر سکتا اور جو فرد اپنی محنت کو دیدہ و دانستہ اس طرح اکارت کرتا ہے وہ یا تو دیوانہ ہے یا اپنے مفادات کا دشمن۔ بظاہر کوئی شخص بھی جسے اپنی عزت کا پاس ہو ان الزامات میں سے کوئی الزام بھی اپنے سر لینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ آخر کون یہ تہمت گوارا کر سکتا ہے کہ اُسے دیوانہ کہا جائے یا اُسے خود اپنا دشمن خیال کیا جائے؟ لیکن تاریخ کا یہ ایک عجوبہ ہے کہ ہم سب انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اس الزام سے برأت کا ہر لمحہ اعلان کرنے کے باوجود اپنی محنت کے ثمرات کو پیہم برباد کرتے رہتے ہیں۔ ہماری اس عاقبت نااندیشانہ روش کا زندگی کے ہر دائرے میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ذرا غور کیجیے کہ انسان اِس بات کا کس قدر شدت کے ساتھ آرزومند ہوتا ہے کہ اُس کی جسمانی صحت اچھی ہو۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے اپنے وسائل کی حد تک بہتر خوراک اور آرام کی دیگر سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی اپنے جسم سے غیر معمولی دلچسپی کا تقاضا ہے کہ وہ ہر اُس چیز یا فعل سے دامن کش رہے جس سے اُس کی تندرستی بگڑنے کا خطرہ ہو کیونکہ یہ اُس کی محنت کا زیاں ہے۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ بلا تامل مضرِ صحت اشیاء کا استعمال کرتے ہیں اور تندرستی کو برباد کرنے والے قبیح افعال کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور اِس طرح خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبریں کھودنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہی معاندانہ طرزِ عمل

انسان اپنی اخلاقی صحت کے بارے میں بھی اختیار کرتا ہے بلکہ اس معاملہ میں وہ اپنا شدید دشمن اور بدخواہ ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کا اگر سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو یہ اندوہناک حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ انسان کو خواہ اس تلخ حقیقت کا واضح شعور نہ ہو مگر اُس کا سب سے بڑا دشمن خود اُس کی اپنی ذات ہے۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے زہر کا پیالہ بھرتا ہے اور اُسے آبِ حیات سمجھ کر غٹا غٹ پی جاتا ہے۔ وہ خود اپنے بازوؤں کی پوری قوت سے اپنے سینے کو چھلنی کرتا ہے مگر اس غلط فہمی میں مسلسل مبتلا رہتا ہے کہ وہ دشمنوں کے سینے چاک کر رہا ہے اور یہی غلط فہمی اُسے جلد ہی تباہی کے مہیب غاروں میں لے جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دُکھی شخص مصائب اور تکالیف سے گھبرا کر ایک مردِ درویش کے پاس گیا اور اسے اپنی بپتا سنانے لگا۔ وہ صاحب کچھ دیر تک اُس کی داستانِ غم جس میں اُس کے متعلقین کے گلے شکوے تھے سُنتے رہے اور پھر معنی خیز نظروں سے اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہنے لگے "تمہارا موقف بڑا کمزور ہے کیونکہ تم اپنے سب سے بڑے دشمن کو بعض مصالح کے تحت چھپانے کی کوشش کر رہے ہو" دل شکستہ انسان نے حیران ہو کر پوچھا "کونسا دشمن"؟ تو اُس بزرگ نے برجستہ کہا "تمہارا اپنا نفس" انہوں نے اپنے اِس فیصلہ کی صحت کا یقین دلانے کے لیے اُس سے کہا "تم صرف ایک دن کے اعمال کو کسی کاغذ پر درج کر کے سونے سے پیشتر اُن کا جائزہ لو اور دیکھو کہ دوسرے افراد نے تمہارا کس قدر نقصان کیا ہے اور ان چند گھنٹوں میں تمہارا خود اپنے ہاتھوں سے کس حد تک زیاں ہوا ہے۔ تم اس میزان پر جتنا غور کرو گے اتنا ہی تمہیں میرے دعوے کے صحیح ہونے کا یقین ہو جائے گا کہ ہمارے متعلقین سب مل کر بھی جس قدر ہمارا نقصان کرتے ہیں وہ اُس بربادی کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا جو ہم خود اپنے ہاتھوں سے لاتے ہیں۔

یہ اُصول اگرچہ انفرادی زندگی میں بھی بالکل صحیح ہے اور ہر قدم پر اس کی صحت کی شہادت ملتی ہے لیکن اجتماعی زندگی میں تو یہ ایک ایسی واضح حقیقت بن کر سامنے آتا ہے جو سورج سے زیادہ روشن ہے۔ آپ اگر تاریخِ انسانی کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کسی قوم کو باہر کے دشمنوں نے اس قدر تباہ نہیں کیا جتنا کہ خود اپنوں نے، خصوصاً اُس قوم کے برسرِ اقتدار طبقوں نے اُسے نقصان پہنچایا ہے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو کے حملوں اور اُن کے مظالم کی داستانیں بلاشبہ دل ہلا دینے والی داستانیں ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ دردناک وہ داستانیں ہیں جن میں ستم زدہ اقوام کا اپنے سربراہوں کے ذریعے لائی ہوئی ہولناک بربادیوں کا تذکرہ ملتا

ہے۔ تاریخ اور فلسفہ کے ماہرین کا فیصلہ ہے کہ قومیں کبھی کبھی آفاتِ سماوی کی وجہ سے بھی تباہ ہوتی ہیں مگر جو تباہی کسی قوم کے افراد خود یا اُس کے برسرِ اقتدار طبقے لاتے ہیں وہ بڑی المناک ہوتی ہے۔

پھر قوم کے ان "خیر خواہوں" کے ہاتھوں لائی ہوئی بربادی کا سب سے زیادہ دلفگار پہلو یہ ہے کہ تعمیر کے پردے میں اس مظلوم قوم کی تخریب کا سامان کیا جاتا ہے اور اُسے ہر لمحہ یہی تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر رہی ہے درآنحالیکہ وہ بربادی کے راستے پر گامزن ہوتی ہے۔ دُور نہ جائیے صرف اپنے ملک کے حالات پر غور کیجیے تو آپ کے سامنے اپنی ہی قوم کے اربابِ بست وکشاد کے ہاتھوں لائی ہوئی بربادی کا رُوح فرسا نقشہ سامنے آجائے گا۔

کسی قوم کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ جس نصب العین کے حصول کی آرزو میں زندہ رہتی اور سرگرمِ عمل ہوتی ہے، اس نصب العین کے بارے میں اس کے اندر ذہنی انتشار پیدا کیا جائے اور اُس کی یکسوئی کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہماری قوم کی زمامِ کار رہی ہے وہ بیانات کی حد تک تو اسلام سے اپنی گہری وابستگی کا برابر اظہار کرتے رہے ہیں لیکن اللہ کے دین کو اِس ملک اور قوم کا صحیح معنوں میں دستورالعمل بنانے کے سلسلہ میں کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا گیا بلکہ جب کبھی اِس ضمن میں عوام کا دباؤ بڑھا تو اس سے گریز کی راہیں ہی نکالنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ غالباً سابق فرمانرواؤں کے اسلام گریز طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ اُس ملک کے اندر جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور جس کے بارے میں اوّل دن ہی سے یہ امر طے شدہ تھا کہ اس خطۂ پاک کو اسلام اور صرف اسلام کی تجربہ گاہ بننا ہے وہاں موجودہ اربابِ اختیار کو اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند لگانے کی جرأت ہوئی اور ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہوا کہ وہ "سوشلزم ہماری معیشت ہے" کے نعرے کے ساتھ انتخاب لڑیں۔ یہ کوئی جذباتی نعرہ نہ تھا بلکہ اس بات کا واضح اعلان تھا کہ ان حضرات کو اب اِس قوم پر اسلام کے نام پر اشتراکی نظام مسلط کرنا ہے۔ اسلام کا ذکر تو برائے بیت تھا ورنہ اصل مقصد تو اشتراکیت کا غلبہ تھا۔ بھٹو صاحب کے اِس نعرے پر جن لوگوں نے لبیک کہا اُن کی فہرست پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو سکتی ہے کہ اُن کے متبعین میں جو فعال کارکن شامل ہوئے اُن میں زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی تھی جو "ایشیا سُرخ ہے" کے ناپاک عزائم رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی

خواہشات کے مطابق ہی پیپلز پارٹی کا منشور تیار ہوا اور اس کی جدوجہد کے خطوط متعین کیے گئے۔ اس پورے قافلے میں کوئی ایک "رجل رشید" بھی ایسا دکھائی نہ دیتا تھا جو "اسلام ہمارا دین ہے" کی مؤثر انداز سے نمائندگی کر سکتا۔ اسلام کے اس واضح خلا کو پُر کرنے کے لیے اُن افراد کو آگے لایا گیا جنھیں اسلام سے زیادہ اپنے مفادات عزیز تھے اور جن کے بارے میں بھٹو صاحب اور اُن کے رفقائے کار کو اس بات کا پورا اطمینان حاصل تھا کہ وہ اُن کی جدوجہد میں اسلام کے کسی تقاضے کو بھی قطعاً حائل نہ ہونے دیں گے بلکہ اللہ کے دین کو نیازمندی کے اُس مقام پر لے آئیں گے جہاں سے اُن کے ہر قول اور فعل کی بآسانی تائید ہوتی رہے گی۔ پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے اور بعد کی سرگرمیوں پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ کیا ان سرگرمیوں سے اسلامی نظام کی راہ ہموار ہوئی ہے یا اشتراکیت کو مختلف دائروں میں نفوذ کرنے کے مواقع فراہم ہوئے ہیں؟

حکومت کے نشریاتی ادارے برسرِ اقتدار طبقے کی بعض ضرورتوں اور مصالح کے تحت ان چند کارروائیوں کا بڑھا چڑھا کر تذکرہ کرتے رہتے ہیں جن سے اُس کی اسلام دوستی ظاہر ہوتی ہے لیکن حکومت کی عام روش کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اُس نے عوام کے احساسات سے کھیلنے کے لیے اسلام کے نام پر جو چند کام کیے ہیں وہ نتائج کے اعتبار سے اُس ضعیفہ کے طرزِ عمل سے کسی طرح بھی مختلف نہیں جو اپنی محنت کے ثمرات کو خود برباد کرنے کا جنون رکھتی ہے۔ حکومت کی اسلامی خدمات میں جن چند نمایاں خدمات کا ذکر کیا جاتا ہے اُن میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد ہے۔ جو لوگ اِس کانفرنس کی کارروائیوں سے واقف ہیں انھیں اس بات کا علم ہے کہ دنیائے اسلام کا سارا جاہ و جلال کس مقصد کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ اس میں نہ تو کشمیر کا کوئی مسئلہ پیش ہوا اور نہ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے کوئی تدبیر سوچی گئی اور نہ مسلم ممالک کے اندر اسلامی نظام کے نفاذ پر غور کیا گیا بلکہ بھارت کی ننگی جارحیت کو جس کی وجہ سے یہ ملک پوری دنیا میں ہدفِ ملامت بنا ہوا تھا، جائز مانتے ہوئے بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا گیا۔ یہ غلط فیصلہ اس ڈرامائی انداز میں کیا گیا کہ ہر انسان سوچنے پر مجبور ہوا کہ کیا مسلم ممالک کی یہ سربراہی کانفرنس منعقد ہی اس غرض کے لیے کی گئی تھی کہ پوری دنیائے اسلام کو اس ذلت میں شریک کیا جائے اور غیر مسلم قوتوں کو یہ بتایا جائے کہ مسلمان اس دور میں کس قدر بے بس اور بے حمیت ہو گئے ہیں۔ حکومت کا یہ فعل کس حد تک تعمیری تھا اس کا

فیصلہ ہر انسان خود کرسکتا ہے۔

حکومت کا دوسرا بڑا اسلامی کارنامہ جسے وہ فخر و مباہات کے جذبات کے ساتھ بار بار بیان کرتی ہے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا معاملہ ہے۔ برسر اقتدار طبقے خصوصاً وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا یہ کارنامہ صحیح معنوں میں قابلِ ستائش ہوتا اگر وہ اپنے اِس اقدام کو پورے خلوص کے ساتھ اس کے طبعی نتائج تک پہنچانے کی کوشش کرتے لیکن حکومت نے اسمبلی کی کارروائی کے بعد اس مسئلہ پر جو معنی خیز سکوت اختیار کر رکھا ہے وہ نہ صرف اضطراب انگیز ہے بلکہ اس سلسلہ میں جو کچھ کیا گیا ہے اُسے غارت کرنے والا ہے۔ برسرِ اقتدار طبقے نے اسمبلی کی ایک قرارداد کے ذریعہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر دُنیائے اسلام سے مدح و ستائش تو حاصل کر لی اور اِس طرح اُسے اپنے گرتے ہوئے وقار کو سنبھالا دینے میں اچھی خاصی مدد ملی۔ لیکن اگر اُسے اِس مسئلہ سے حقیقی دلچسپی ہوتی تو صرف اِس قرارداد کو منظور کر لینے پر اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ اس کے عملی تقاضوں کی تکمیل کے لیے بھی بھرپور کوششیں کی جاتیں۔ لیکن قرارداد پاس کرنے کے بعد اس سنگین معاملے کے بارے میں جس تغافل کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اُس سے اِس اہم فیصلہ کی معنویت ختم ہو رہی ہے۔ یہ حکومت کی اِس افسوسناک غفلت کا نتیجہ ہے کہ ملک کی ایک حقیر سی اقلیت، جس کی حیثیت کسی نظریاتی جماعت کی نہیں بلکہ ملّتِ اسلامیہ کے خلاف ایک سازشی ٹولہ کی سی ہے، اِس فیصلہ کو قبول کرنے سے مسلسل انکار کر رہی ہے۔ آخر یہ غداری نہیں تو اور کیا ہے؟ اِس گروہ کے رہنماؤں اور اس کے ذمہ دار افراد کے بیانات دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسمبلی کے اِس متفقہ فیصلہ کو ارکانِ اسمبلی کی محض غوغا آرائی سمجھتا ہے بلکہ بڑی ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس کی تذلیل کر رہا ہے۔ عقل یہ باور نہیں کرتی کہ حکومت اِن لوگوں کی باغیانہ سرگرمیوں سے بے خبر ہو۔ پھر ذہن یہ تسلیم کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوسکتا کہ حکومت اِن کی قوت کے سامنے بے بس ہے۔ اگر اِن مفروضات میں سے کوئی مفروضہ بھی صحیح نہیں تو اِن حالات میں اِس امر کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ آخر نہایت ہی جارحانہ عزائم رکھنے والی اِس اقلیت کی تخریبی سرگرمیوں کو کیوں برداشت کیا جا رہا ہے؟ خدا کو کسی نے دیکھا نہیں بلکہ اُسے اُس کی قدرت ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اِسی طرح حکومت کی نیت کا اُس کی کارروائیوں ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اُس کا ان معاندانہ سرگرمیوں کے بارے میں خاموش تماشائی کا سا طرزِ عمل اس حقیقت

کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس فیصلہ سے جو سیاسی فوائد حاصل کرنا چاہتی تھی انہیں حاصل کرنے کے بعد اب اس ضمن میں کوئی مزید کارروائی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی بلکہ اس فرقہ کی تھوڑی بہت ناراضگی اور رنجش کو اپنے مشفقانہ طرزِ عمل سے محبت اور مودّت میں بدلنے کی آرزومند ہے اور اِس بنا پر اِس کی اُن حرکات کو بخوشی گوارا کر رہی ہے جن سے ملکی معاملات میں بعض سنگین نوعیت کی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ جب ایک گروہ علانیہ ملکی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اُس سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی تو کیا اِس سے لوگوں کے اندر قانون شکنی کا رجحان پیدا نہ ہوگا؟ حال ہی میں قومی اسمبلی کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی کے ایک مُتبع کی حیثیت نمائندۂ اقلیت نامزدگی اور اِس پر قادیانی جماعت کی اِس انتخاب کے متعلق برہمی اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اس جماعت کے نزدیک اسمبلی کا یہ فیصلہ پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ قادیانیوں کی اس بے جا جسارت کی وجہ آخر اِس کے علاوہ اور کیا ہے کہ حکومت اِس فیصلے کے نفاذ کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں اور وہ فضا میں تھوڑی سی ہلچل پیدا کرنے کے علاوہ اِس سلسلہ میں کوئی ٹھوس کارروائی کرنا نہیں چاہتی اور اس معاملہ میں اب وہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے وقت گزارنے کا ارادہ رکھتی ہے تاکہ اِس فرقہ کے سامنے اُس کے تعلقات اُسی سطح پر بحال ہو جائیں جس پر کہ گزشتہ انتخاب کے موقع پر تھے۔ کیا حکومت کی یہ روش اُس بڑھیا کے طرزِ عمل سے مختلف ہے جو اپنی محنت کا سُوت اپنے ہاتھوں ضائع کر دیتی ہے؟

حکومت کی اسلامی خدمات میں ایک نمایاں خدمت یہ ہے کہ اُس نے اِس سال ربیع الاوّل کے بابرکت مہینہ میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقد کرائی جس میں دنیا کے نامور اہلِ علم نے شریک ہو کر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ حکومت کا یہ اقدام ہر لحاظ سے بڑا مستحسن تھا کیونکہ اسلام کی کوئی تبلیغ ذکرِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ اگر ہمیں دینِ حق کو دنیا میں ایک غالب قوت بنانا ہے تو یہ مقدس مقصد حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ اپنا کر اور آپؐ کا حیات آفریں پیغام پوری بنی نوعِ انسان تک پہنچا کر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کانفرنس سے حضورؐ کے غلاموں کو اپنے آقائے نامدارؐ کی پاکیزہ زندگی اور آپؐ کی پاکیزہ تعلیمات سے لوگوں کو روشناس کرانے کے متعدد مواقع فراہم ہوئے اور غیر مسلموں کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ وہ محسنِ انسانیتؐ کے پیغام کو مسلمان مفکرین کی زبان سے سُن سکیں۔ اِس مقدس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں وزیراعظم بھٹو صاحب نے اسلام کے بارے

میں معذرت خواہانہ طرزِ فکر کی جس جوش اور ولولہ کے ساتھ تردید کی وہ بھی قابلِ ستائش ہے۔ لیکن اِس بابرکت تقریب میں عوام کی شرکت کو جس طرح محدود رکھا گیا اور اِس میں بعض غیر مسلم مستشرقین کے گمراہ کن خیالات کی جس انداز میں اشاعت کی گئی، مزید برآں کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے مدعوئینِ کانفرنس کی ضیافتِ طبع کے لیے رنگا رنگ کے جو پروگرام ترتیب دیے گئے انہیں دیکھنے کے بعد اگر کانفرنس کے بارے میں لوگوں کے اندر بدگمانیاں پھیلنے لگیں تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ یہاں اِس کانفرنس کے اِن افسوسناک پہلوؤں پر کوئی تفصیلی تبصرہ مقصود نہیں بلکہ صرف چند گوشوں کی طرف توجہ دلانا مطلوب ہے۔

کانفرنس میں انگلستان کے معروف مستشرق پروفیسر منٹگمری واٹ نے جو مقالہ پڑھا وہ بڑا غلط تھا۔ جن لوگوں نے حضورؐ کی سیرت پر اِس مستشرق کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے وہ اِس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ ان میں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ، آپؐ کی تعلیمات اور آپؐ کے کارناموں کا اشتراکی نقطۂ نظر سے تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور قارئین کو یہ تأثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضورؐ نے جو کچھ کیا وہ اپنے عہد کے مخصوص معاشی تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ یہ شخص بڑی چالاکی اور عیاری سے اُس دَور کے مادّی تقاضوں کو حضورؐ کی زندگی کا معاشرتی اور سیاسی پس منظر باور کرا کر مسلمانوں کو اِس بات کا قائل کرنا چاہتا ہے کہ حضورؐ کے کارنامے اُن کے اپنے عہد میں خواہ کتنے ہی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوں مگر وہ جدید دنیا میں نئے تقاضوں کے تحت انسانیت کے رہنما اُصول نہیں بن سکتے۔ چنانچہ واٹ مُعاشرتی اور سیاسی پس منظر پر بڑا زور دیتا ہے۔ اِس کانفرنس میں اُس نے جو مقالہ پیش کیا وہ اِسی طرزِ فکر کا ترجمان ہے جس میں بڑی پُرکاری کے ساتھ مُسلم عُلماء کو اِس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ حضورؐ کی زندگی اور آپؐ کی تعلیمات کو اُن کے سماجی اور معاشی پس منظر میں رکھ کر مطالعہ کریں اور پھر اُن کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں۔ یہ دعوت بظاہر بڑی معصوم نظر آتی ہے اور ایک سطح بین شخص اِس میں مُضرّت کا کوئی خاص پہلو نہیں پاتا۔ مگر اِس کے مضمرات پر اگر دِقّتِ نظر سے غور کیا جائے تو یہ دعوت پورے دین کو منہدم کرنے والی ہے۔ اِس دعوت کا مطلب یہ ہے کہ ہر دَور کے چونکہ کچھ مخصوص تقاضے ہوتے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند شخصیتیں اُبھر کر سامنے آتی ہیں، اس لیے وہ جو کچھ کہتی اور کرتی ہیں اُن سے اُس خاص عہد کے مسائل حل کرنے میں تو بڑی مدد ملتی ہے مگر جب نیا دَور نئے تقاضوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے تو گذشتہ اَدوار کی شخصیتیں اور اُن کے پیش کردہ افکار و اعمال (باقی برصفحہ ۷۴)

دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے قریش کی تدبیریں

(۴)

سورۂ الم نشرح کا نزول اسی کے قریب زمانے میں جبکہ دعوتِ اسلامی کے آغاز کی مشکلات حضورؐ کے لیے سخت پریشان کن ثابت ہو رہی تھیں، آپ کی تسلی کے لیے سورۂ الم نشرح نازل ہوئی جس کے بعض متعلقہ اجزاء یہاں مع تشریح نقل کیے جاتے ہیں:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (آیت ۱) "(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟"

اس سوال سے کلام کا آغاز، اور پھر بعد کا مضمون خود صاف ظاہر کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس زمانے میں اُن شدید مشکلات پر سخت پریشان تھے جو علی الاعلان دعوتِ اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد ابتدائی دور میں پیش آ رہی تھیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر کے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اے نبیؐ، کیا ہم نے یہ اور یہ عنایات تم پر نہیں کی ہیں؟ پھر ان ابتدائی مشکلات پر تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سینہ کھولنے کا لفظ قرآن مجید میں جن مواقع پر آیا ہے ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں:-

۱۔ سورۂ انعام آیت ۱۲۵ میں فرمایا فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ "پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے"۔ اور سورۂ زمر آیت ۲۲ میں فرمایا اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ "تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو پھر وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہو......"

ان دونوں مقامات پر شرحِ صدر سے مراد ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردّد سے پاک ہو کر اِس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جانا ہے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی عقائد، وہی اُصولِ اخلاق و تہذیب و تمدّن اور وہی احکام و ہدایات بالکل صحیح ہیں جو اسلام نے انسان کو دیے ہیں۔

۲۔ سورۂ شعراء آیت ۱۲-۱۳ میں ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جب اللہ تعالیٰ نبوت کے منصبِ عظیم پر مامور

کر کے فرعون اور اس کی عظیم سلطنت سے جا ٹکرانے کا حکم دے رہا تھا تو انھوں نے عرض کیا رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ۔ "میرے رب میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے"۔ اور سورہ طٰہٰ آیات ۲۵-۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسی موقع پر حضرت موسٰیؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ۔ "میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے"۔ یہاں سینے کی تنگی سے مراد یہ ہے کہ نبوت جیسے کارِ عظیم کا بار سنبھالنے اور تن تنہا کفر کی ایک جابر و قاہر طاقت سے ٹکر لینے کی آدمی کو ہمت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرحِ صدر سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بلند ہو جائے، کسی بڑی سے بڑی مہم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو سرانجام دینے میں بھی اسے تامّل نہ ہو، اور نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی اس میں ہمت پیدا ہو جائے۔

غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں ہی معنی مراد ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکینِ عرب، نصاریٰ، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے، اور اس حنیفیت پر بھی مطمئن نہ تھے جو عرب کے بعض قائلینِ توحید میں پائی جاتی تھی، کیونکہ یہ ایک مبہم عقیدہ تھا جس میں راہِ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی۔ (اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۵ میں کر چکے ہیں)۔ لیکن آپ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہِ راست کیا ہے، اس لیے آپ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا تھے۔ نبوت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس خلجان کو دُور کر دیا اور وہ راہِ راست کھول کر آپ کے سامنے رکھ دی جس سے آپ کو اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ حوصلہ، وہ ہمت، وہ اولوالعزمی اور وہ وسعتِ قلب عطا فرما دی جو اس منصبِ عظیم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ آپ اُس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سما نہ سکتا تھا۔ آپ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دُور کرنے اور سنوار دینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ آپ اِس قابل ہو گئے کہ جاہلیت میں مستغرق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اکھڑ معاشرے میں کسی سروسامان اور ظاہراً کسی پشت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر اسلام کے علَم بردار بن کر کھڑے ہو جائیں، مخالفت اور دشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے سے نہ ہچکچائیں، اس راہ میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پیش آئیں ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں، اور کوئی طاقت آپ کو اپنے موقف سے نہ ہٹا سکے۔ پس

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ، یہ شرحِ صدر کی بے بہا دولت جب اللہ نے آپؐ کو عطا کر دی ہے تو آپ اُن مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغازِ کار کے اِس مرحلے میں پیش آ رہی ہیں؟[۱]

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (آیت ۴) اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا[۲]

یہ بات اُس وقت فرمائی گئی تھی جب کہ قریش کے سارے دشمنانِ اسلام حضورؐ کو بدنام کرنے میں لگے ہوئے تھے اور خاص طور پر حج کے زمانہ میں ولید بن مُغیرہ کی تجویز کردہ اسکیم کے مطابق (جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں) حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جا کر آپ کے خلاف ایسی باتیں پھیلاتی جا رہی تھیں جن سے لوگ آپ سے بدگمان ہو کر آپ سے دُور بھاگنے لگیں؟ پھر اِس حالت میں یہ آپ کے رَفعِ ذکر کی خوشخبری کیسی تھی؟

سب سے پہلے تو آپ کے رفعِ ذکر کا کام اللہ تعالیٰ نے خود آپ کے دشمنوں ہی سے لیا۔ کفارِ مکّہ نے آپ کو زک دینے کے لیے جو طریقے اختیار کیے تھے ان کی وجہ سے آپ کا اسمِ گرامی عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا اور مکّہ کے گوشۂ گمنامی سے نکال کر خود دشمنوں ہی نے آپ کو تمام ملک کے قبائل سے متعارف کرا دیا۔ اس کے بعد یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ شخص ہے کون؟ کیا کہتا ہے؟ کیسا آدمی ہے؟ اس کے "جادو" سے متاثر ہونے والے لوگ کیسے ہیں اور ان پر اس کے "جادو" کا آخر کیا اثر پڑا ہے؟ کفارِ مکّہ کا پروپیگنڈا جتنا جتنا بڑھتا چلا گیا لوگوں میں یہ جستجو بھی بڑھتی چلی گئی۔ پھر جب اِس جستجو کے نتیجے میں لوگوں کو آپ کے اخلاق اور آپ کی سیرت و کردار کا حال معلوم ہوا، جب لوگوں نے قرآن سُنا اور انہیں پتہ چلا کہ وہ تعلیمات کیا ہیں جو آپ پیش فرما رہے ہیں، اور جب دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ جس چیز کو جادو کہا جا رہا ہے اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگیاں عرب کے عام لوگوں کی زندگیوں سے کس قدر بلند اور پاکیزہ ہو گئی ہیں، تو وہی بدنامی نیک نامی سے بدلنی

---

[۱] بعض مفسرین نے شرحِ صدر کو شقِّ صدر کے معنی میں لیا ہے اور اس آیت کو اُس معجزۂ شقِّ صدر کا ثبوت قرار دیا ہے جو احادیث کی روایات میں بیان ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معجزے کے ثبوت کا مدار احادیث کی روایات ہی پر ہے، قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرحِ صدر کو کسی طرح بھی شقِّ صدر کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ حمل الشرح فی الاٰیۃ علٰی شق الصدر ضعیف عند المحققین "محققین کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شقِّ صدر پر محمول کرنا ایک کمزور بات ہے"۔

[۲] اس سے پہلے آیات ۲-۳ کی تشریح گزر چکی ہے۔

شروع ہوگئی، حتیٰ کہ ہجرتِ مدینہ کا زمانہ آتے آتے تک نوبت یہ پہنچ گئی کہ دُور و نزدیک کے عرب قبائل میں شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو جس میں کسی نہ کسی شخص یا کنبے نے اسلام قبول نہ کرلیا ہو، اور جس میں کچھ نہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کی دعوت سے ہمدردی و دلچسپی رکھنے والے پیدا نہ ہوگئے ہوں۔ یہ حضورؐ کے رفع ذکر کا پہلا مرحلہ تھا جو اس سورہ کے نزول کے وقت گزر رہا تھا اور سب اس کے اثرات دیکھ رہے تھے۔

اس کے چند ہی سال بعد اس کے دوسرے مراحل پیش آئے جن کو اُس وقت کوئی بھی نہ دیکھ سکتا تھا، نہ اُن کا تصور کرسکتا تھا۔ بس اللہ ہی اُن کا علم رکھتا تھا، اور اسی نے ان کی بشارت حضورؐ کو دی۔ ہجرت کے بعد منافقین، یہود، اور عرب کے تمام اکابر مشرکین ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے، اور دوسری طرف مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست خدا پرستی و خدا ترسی، زُہد و تقویٰ، طہارتِ اخلاق، حسنِ معاشرت، عدل و انصاف، انسانی مساوات، مالداروں کی فیاضی، غریبوں کی خبرگیری، عہد و پیمان کی پاسداری اور معاملات میں راستبازی کا وہ عملی نمونہ پیش کر رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو مسخّر کرتا چلا جا رہا تھا۔ دشمنوں نے جنگ کے ذریعے سے حضورؐ کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی کوشش کی، مگر آپ کی قیادت میں اہلِ ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے اپنے نظم و ضبط، اپنی شجاعت، اپنی موت سے بے خوفی، اور حالتِ جنگ تک میں اخلاقی حدود کی پابندی سے اپنی برتری اس طرح ثابت کر دی کہ سارے عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ دس سال کے اندر حضورؐ کا رفعِ ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا، اُس کا گوشہ گوشہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی صدا سے گونج اُٹھا۔ پھر خلافتِ راشدہ کے دور سے آپ کا نام مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہوگیا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور وہاں دن میں پانچ مرتبہ اذان میں بآوازِ بلند محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں حضورؐ پر درود نہ بھیجا جا رہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپ کا ذکرِ خیر نہ کیا جا رہا ہو، اور سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب روئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ حضورؐ کا ذکرِ مبارک نہ ہو رہا ہو۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ، اِس وقت کے شدائد و مصائب سے تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ تمھارے رفعِ ذکر کا تو ہم نے وہ انتظام کیا ہے

جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ حدیث میں حضرت ابوسعید خُدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جبریلؑ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کس طرح تمہارا رفعِ ذکر کیا؟ میں نے عرض کیا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا" (ابن جریر، ابن ابی حاتم، مُسند ابویعلیٰ، ابن المُنذر، ابن حبان، ابن مَردُوْیہ، ابونُعیم)۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ (آیات: ۵، ۶)

پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بیشک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔

اِس بات کو دو مرتبہ دُہرایا گیا ہے تاکہ حضورؐ کو پوری طرح تسلی دے دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپ اس وقت گزر رہے ہیں یہ زیادہ دیر تک رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد قریب ہی اچھے حالات چلے آ رہے ہیں۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہو کیونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں۔ لیکن تنگی کے بعد فراخی کہنے کے بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کیے گئے ہیں کہ فراخی کا دور اِس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی لگا چلا آرہا ہے۔

باب (۹)

ہجرتِ حبشہ

دین میں ہجرت کی اہمیت

قرآن مجید میں جہاد کے بعد دوسری اہم ترین چیز جس کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ہجرت ہے۔ اس ہجرت کی اسلام میں کیوں اتنی اہمیت ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ اہم اگر کوئی چیز ہے تو وہ نہ اس کا اپنا وطن ہے، نہ اس کی قوم ہے، نہ اس کی روٹی ہے، نہ اس کا پیٹ ہے، بلکہ اس کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ جن اُصولوں پر وہ ایمان لایا ہے ان کے مطابق وہ زندگی بسر کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکے۔ اگر وہ اُن اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکے تو اس کے لیے آزادی کیا خود زندگی ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خدا کی راہ میں قربان کر دینا زیادہ بہتر

سمجھے گا بہ نسبت اس کے کہ اُن اصولوں کو قربان کر دے جن پر اُس کے ایمان کا دار و مدار ہے اور جن کے متعلق وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اصول حق ہیں اور خدا اور رسولؐ کے دیے ہوئے ہیں۔

عرب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن پیرووں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی وہ اسی بنا پر تھی عرب اور قریشی اور مکّی ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنے ملک، اپنے قبیلے اور اپنے شہر میں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، لیکن کوئی آزادی اگر حاصل نہیں تھی تو صرف مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے وطن کو چھوڑا اور ایک دوسرے ملک میں چلے گئے جہاں ایک دوسری قوم آباد تھی اور ایک دوسری قوم کے ہاتھ میں حکومت تھی۔ اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو کیوں کی؟ آپ مکّہ کے باشندے تھے۔ مکہ میں آپ کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو مکہ کے کسی شہری کو حاصل ہو سکتے تھے۔ آپ کے ساتھیوں کو بھی وہ تمام حقوق حاصل تھے جو کسی قریشی کو قریشی ہونے کی بنا پر حاصل ہوتے تھے۔ لیکن جس چیز کی وجہ سے آپؐ نے اور آپؐ کے ساتھیوں نے گھر بار چھوڑا، رشتہ داروں کو چھوڑ دیا، جائدادیں چھوڑ دیں اور تن کے کپڑوں میں نکل کھڑے ہوئے وہ چیز یہ تھی کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اُن کو آزادی میسّر نہیں تھی۔ اسی آزادی کے لیے انہوں نے وطن چھوڑ دیا اور ایک دوسرے شہر میں جاکر آباد ہوئے۔

قرآن میں مسلمانوں کو ہجرت کے لیے تیار کیا جاتا ہے

مکّہ میں جب مسلمانوں پر ظلم کی حد ہو گئی تو قرآن مجید میں اُن کو ہجرت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ	اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین
وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۔	وسیع ہے، پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ۔ ہر متنفس
كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۔ ثُمَّ	کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا
اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	کر لائے جاؤ گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ	نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں
الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ	رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ	رہیں گے، کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے
فِيْهَا نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ الَّذِيْنَ	لیے ـــــ اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا ہے اور
صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۔	جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور کتنے ہی جانور

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۔ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے ۔ اللہ ہی اُن کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی، اور وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے ۔

(العنکبوت: ۵۶ تا ۶۰)

پہلی آیت میں اشارہ ہے ہجرت کی طرف ۔مطلب یہ ہے کہ اگر مکے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے، جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ ۔ تم کو قوم و وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیے ۔ اِس میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے ۔ اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے ۔ جو سچا مومن ہے وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم، وطن اور ملک کو لات مار دے گا ۔ جو جھوٹا مدعی ایمان ہے وہ ایمان کو چھوڑ دے گا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا ۔ اس آیت میں صراحت کے ساتھ مسلمانوں کو بتا دیا گیا کہ ایک سچا خدا پرست انسان محبِ قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہو سکتا ۔ اُس کے لیے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے جس پر وہ دنیا کی ہر چیز کو قربان کر دے گا مگر اسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا ۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ تم جان کی فکر نہ کرو ۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے ۔ ہمیشہ رہنے کے لیے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے ۔ لہٰذا تمہارے لیے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائقِ فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کیے جائیں ۔ آخر کار تمہیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے ۔ اگر دنیا میں جان بچانے کے لیے ایمان کھو کر آئے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہوگا اور ایمان بچانے کے لیے جان کھو کر آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہوگا ۔ پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے؟ جان پر قربان کیا ہوا ایمان یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان ؟

تیسری اور چوتھی آیت میں بتایا گیا ہے کہ ایمان اور نیکی کے راستہ پر چل کر بالفرض اگر تم دُنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دُنیوی نقطۂ نظر سے سراسر ناکام بھی رہے تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہر حال ہوگی

اور نری تلافی ہی نہ ہوگی بلکہ بہترین اجر نصیب ہوگا ۔ جو لوگ ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے ہوں، جنھوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جان پر جھیلا ہو اور منہ نہ موڑا ہو، جنھوں نے ترکِ ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور ان کی طرف ذرہ برابر التفات نہ کیا ہو، جنھوں نے کفار و فساق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا ہو اور ان کی دولت و حشمت پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالی ہو، جنھوں نے بھروسہ اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار اور اپنے کنبے قبیلے پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا ہو، جو اسبابِ دُنیوی سے قطع نظر کرکے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ سہنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کے لیے تیار ہو گئے ہوں اور وقت آیا تو گھربار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے ہوں، ایسے مومن و صالح بندوں کا اجر ان کے رب کے ہاں ضائع نہ ہوگا ۔ وہ اس دنیا میں بھی ان کی دستگیری فرمائے گا اور آخرت میں بھی ان کے عمل کا بہترین اجر دے گا۔

آخر میں یہ تلقین کی گئی کہ ہجرت کرنے میں فکرِ جان کی طرح فکرِ روزگار سے بھی تمھیں پریشان نہ ہونا چاہیے۔ آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو ہوا اور خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں، ان میں سے کون اپنا رزق اُٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو ان سب کو پال رہا ہے ۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل ہی جاتا ہے ۔ لہٰذا اہلِ ایمان یہ سوچ سوچ کر ہمت نہ ہاریں کہ اگر ایمان کی خاطر گھربار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے ۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے انھیں بھی دے گا۔

دعوتِ حق کی راہ میں ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جس میں ایک حق پرست آدمی کے لیے اِس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ عالمِ اسباب کے تمام سہاروں سے قطع نظر کرکے محض اللہ کے بھروسے پر جان جوکھوں کی بازی لگا دے ۔ اِن حالات میں وہ لوگ کچھ نہیں کرسکتے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں، اور قدم اُٹھانے سے پہلے جان کے تحفظ اور رزق کے حصول کی ضمانتیں تلاش کرتے ہیں ۔ درحقیقت اِس طرح کے حالات بدلتے ہی اُن لوگوں کی طاقت سے ہیں جو سر ہتھیلی پر رکھ کر اُٹھ کھڑے ہوں اور ہر خطرے کو انگیز کرنے کے لیے بے دھڑک تیار ہو جائیں ۔ انھی کی قربانیاں آخرکار وہ وقت لاتی ہیں جب اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے اور اُس کے مقابلے میں سارے کلمے پست ہوکر رہ جاتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا گیا:

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا (اے نبیؐ) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو،

رَبَّکُمْ ۔ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ ۔ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۔ اِنَّمَا یُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۔ (الزمر ۔ آیت ۱۰)

اپنے رب سے ڈرو ۔ جن لوگوں نے اِس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے ۔ اور خدا کی زمین وسیع ہے ۔ صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا ۔

یہاں بھی اہلِ ایمان کو ہدایت فرمائی گئی کہ اگر اللہ کی بندگی کے لیے ایک جگہ تنگ ہو گئی ہو تو اس کی زمین وسیع ہے ، اپنا دین بچانے کے لیے کسی اور طرف نکل کھڑے ہو ۔ اس کے ساتھ ان کو یہ خوشخبری بھی دی گئی کہ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے ۔ ان کی دنیا بھی سدھرے گی اور آخرت بھی ، کیونکہ انہوں نے دین کو دُنیا اور اس کے عیش و آرام و آسائش پر ترجیح دی ہے ، محض دین کی خاطر گھر سے بے گھر ، در سے بے در ، وطن سے بے وطن ہو کر دوسرے شہر یا علاقہ میں ہجرت کی ہے ، ایک شہر یا علاقہ یا ملک جب اللہ کی بندگی کرنے کے لیے تنگ ہو گیا تو دوسری جگہ چلے گئے ۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے بے حساب اجر ہے جو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلنے میں ہر طرح کے مصائب و شدائد برداشت کر لیں اور راہِ حق سے نہ ہٹیں ۔ یہ بے حساب اجر کا وعدہ صرف ہجرت کرنے والوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ظلم کی سرزمین میں جم کر ہر آفت کا سامنا کرتے چلے جائیں ۔

ہجرت کے موقع پر ہدایات

قرآن مجید میں مکّہ کے مظلوم مسلمانوں کو صرف ہجرت کی تلقین ہی نہیں کی گئی ، بلکہ دو قسم کی ہدایات بھی دی گئیں ۔

چونکہ مسلمان ہجرت کر کے ایک عیسائی ملک کی طرف جا رہے تھے اس لیے اِس موقع پر سورۂ مریم نازل کی گئی جس کے ابتدائی دو رکوعوں میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزین گروہ کی حیثیت سے جا رہے تھے ، مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین کے معاملہ میں ذرہ برابر مداہنت کرنے کی تعلیم نہ دی بلکہ چلتے وقت زادِ راہ کے طور پر یہ سورت ان کے ساتھ کی تاکہ عیسائیوں کے ملک میں عیسیٰ علیہ السلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور ان کے ابن اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کر دیں ، خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو ۔

دوسری ہدایت یہ کی گئی کہ :

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا	اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے ،
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ، اِلَّا الَّذِيْنَ	سوائے اُن لوگوں کے جو ظالم ہیں - اور ان سے کہو
ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ، وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا	کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی
بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ	گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی
وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ	تھی - ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم
لَهٗ مُسْلِمُوْنَ - (العنکبوت : ۴۶)	اسی کے مُسلم (فرمان بردار) ہیں -

یعنی اہل کتاب (عیسائیوں) سے جب سابقہ پیش آئے تو ان میں سے جو ظالم ہیں ان سے تو اُلجھنے کی ضرورت نہیں، مگر جو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تیار ہوں ان سے نہایت معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں اور افہام و تفہیم کے انداز میں بحث کرو - ان کو بتاؤ کہ ہم کوئی متعصب گروہ نہیں ہیں جو اپنے ہاں آئی ہوئی کتاب کو مانتے ہوں اور تمہارے ہاں آئی ہوئی کتابوں کو نہ مانتے ہوں - ہم تو حق کے پرستار ہیں - خدا کی طرف سے جو کچھ ہمارے ہاں آیا ہے اُسے بھی برحق مانتے ہیں اور جو کچھ تمہارے ہاں آیا ہے اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں - ہمارا خدا اور تمہارا خدا جدا جدا نہیں ہے بلکہ ایک ہی خدا ہے جس کے ہم بھی ماننے والے ہیں اور تم بھی - ہم نے اُسی ایک خدا کی بندگی و اطاعت کا طریقہ اختیار کیا ہے -

ہجرت حبشۂ اُولیٰ | حالات جب ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۴۵ عام الفیل (۵ بعدِ بعثت) میں حضورؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ لو خرجتم الی ارض الحبشة فان بها ملكًا لا يُظلم عنده احد وهي ارض صدق حتٰى يجعل الله لكم فرجًا مما انتم فيه - "اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ - وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے - جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ کرے تم لوگ وہاں ٹھیرے رہو"۔ اس ارشاد کے مطابق حبش کی طرف پہلی ہجرت ہوئی جس میں گیارہ مردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی - قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا مگر خوش قسمتی سے شُعَیبَہ کے بندرگاہ پر ان کو بروقت حبش کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے -

پہلی ہجرت کے مہاجرین | ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے اس پہلی ہجرت کے مہاجرین کی جو فہرست دی ہے وہ یہ ہے :-

۱- بنی امیہ میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان۔

۲- ان کی بیوی حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن عبد البرؒ کا بیان ہے کہ اُن کے ساتھ ام ایمنؓ بھی گئی تھیں)۔

۳- بنی عبدِ شمس بن عبد مناف میں سے حضرت ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ۔

۴- ان کی بیوی سہلہؓ بنت سہیل بن عمرو (جو بنی عامر بن لوی میں سے تھیں)۔

۵- بنی اسد بن عبد العزیٰ بن قصی میں سے حضرت زبیرؓ بن العوام۔ (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی)

۶- بنی عبد الدار بن قصی میں سے حضرت مصعبؓ بن عمیر۔

۷- بنی زہرہ بن کلاب میں سے حضرت عبد الرحمنؓ بن عوف۔

۸- بنی مخزوم میں سے حضرت ابو سلمہؓ بن عبد الاسد۔

۹- ان کی بیوی ام سلمہؓ (یہ بھی بنی مخزوم میں سے تھیں اور ابوجہل کی سگی چچا زاد بہن تھیں)۔

۱۰- بنی جمح میں سے حضرت عثمانؓ بن مظعون۔ (ام المومنین حضرت حفصہؓ کے ماموں)۔

۱۱- حلفائے بنی عدی میں سے عامرؓ بن ربیعۃ العنزی (حلیفِ آلِ خطاب)۔

۱۲- ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ۔ (یہ خود بنی عدی میں سے تھیں)۔

۱۳- بنی عامر بن لوی میں سے ابو سبرہؓ بن ابی رہم۔

۱۴- بنی الحارث بن فہر میں سے سہیلؓ بن بیضاء۔

ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے ان پر دو اور ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ حاطبؓ بن عمرو بن عبد شمس اور عبداللہؓ بن مسعود حلیفِ بنی زہرہ۔ ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ بعد میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب بھی ان سے جا ملے تھے۔ مگر موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں بیان کیا ہے کہ وہ پہلی ہجرت میں نہیں بلکہ دوسری ہجرت میں گئے تھے۔ اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود پہلی ہجرت کے مہاجرین میں سے نہیں بلکہ دوسری ہجرت کے مہاجرین میں سے تھے۔ نیز زرقانی نے بعض سیرت نگاروں کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ابو سبرہؓ کے ساتھ اُن کی بیوی ام کلثومؓ بھی گئی تھیں جو سہیل بن عمرو کی دوسری بیٹی تھیں۔ بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ان میں سب سے پہلے نکلنے والے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے، اور ان کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کی ہے۔ (باقی)

اِتمامِ نعمت

(۲)

سید ریاض الحسن صاحب ایڈووکیٹ

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو شمارہ مارچ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں سنت کا مطلب وہ سیرت وطریقہ وسلوک ہے جو دین میں موجود ہے۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۶۸)۔

حافظ ابن رجب رح لکھتے ہیں:۔

فکل من احدث شیئا ونسبہ الی الدین ولم یکن لہ اصل من الدین یرجع الیہ فھو ضلالۃ والدین بریٔ منہ وسواء فی ذلک الاعتقادات او الاعمال او الاقوال الظاھرۃ والباطنۃ واما ما وقع فی کلام السلف من استحسان بعض البدع فان ذلک فی البدع اللغویۃ لا الشرعیۃ (جامع العلوم والحکم ج ۱ ص ۱۹۳)۔ "جس نے بھی کوئی چیز ایجاد کی اور اس کو دین کی طرف منسوب کیا جبکہ اس کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے جس کی طرف وہ راجع ہو تو وہ گمراہی ہے اور دین اس سے بری ہے۔ برابر ہے کہ وہ ایجاد کردہ چیز اعتقادات ہوں یا اعمال یا اقوال ظاہرہ اور باطنہ۔ رہا سلف کے کلام میں بعض بدعات کے حسن ہونے کا ثبوت، تو ٹھیک ہے، مگر وہ حسن لغوی بدعات میں ہے نہ کہ شرعی بدعات میں۔"

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

اقول انتظام الدین یتوقف علی اتباع سنن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۱۷۰) "میں کہتا ہوں کہ دین کا انتظام صرف اس بات پر موقوف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا اتباع کیا جائے۔"

ملا علی قاری لکھتے ہیں:۔

قال الله تعالیٰ الیوم اکملت لکم دینکم الآیۃ فلا نحتاج فی تکمیلہ الی امر خارج عن الکتاب والسنۃ (شرح فقہ اکبر ص ۱۰) " اللہ فرماتا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین مکمل کر دیا ہے۔ اب ہمیں دین کی تکمیل میں کسی ایسے امر کی حاجت اور ضرورت نہیں ہے جو کتاب وسنّت سے خارج ہو۔"

مجدد الف ثانی فرماتے ہیں:۔

نورِ سنتِ سَنِیّہ را ظلماتِ بدعتہا مستور ساختہ اند و رونق ملت مصطفویہ را کدورتِ امورِ محدثہ ضائع گردانیدہ عجب تر آنکہ جمعے آں محدثات را امورِ مستحسنہ میدانند و آں بدعتہا را حسنات می انگارند و تکمیل دین و تتمیم ملت ازاں محدثات می جویند و در اتیان آں امور ترغیبات می نمایند۔ ہداہم اللہ صراط المستقیم۔ مگر نمی دانند کہ دین پیش ازیں محدثات کامل شدہ بود و نعمت تمام گشتہ و رضائے حق تعالیٰ بحصول پیوستہ کما قال اللہ تعالیٰ الیوم اکملت لکم دینکم الآیۃ پس کمال دین ازیں محدثات جستن فی الحقیقت انکار نمودن است بمقتضائے ایں آیت کریمہ۔ (مکتوبات حصہ چہارم مکتوب ص ۲۶۰) " روشن سنت کے نور پر بدعات کی تاریکیاں چھا گئی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت کی رونق کو نئے نئے امور کی کدورت نے ضائع کر دیا ہے۔ حیرت تو ان لوگوں پر ہے جو ان بدعات اور محدثات کو اچھے امور تصور کرتے ہیں اور ان بدعات کو نیکیاں یقین کرتے ہیں کہ وہ دین کی تکمیل اور ملت کی تتمیم ان بدعات سے تلاش کرتے ہیں اور ان امور کی ادائیگی میں ترغیب دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو صراط مستقیم پر چلائے۔ شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ دین ان محدثات سے پہلے ہی مکمل ہو چکا ہے اور نعمت تمام ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اس سے وابستہ ہو چکی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔ اب دین کا کمال ان بدعات سے تلاش کرنا درحقیقت اس آیت کریمہ کے مضمون سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔"

۳۔ حدثنا عثمان بن ابی شیبہ قال حدثنا ابو النضر یعنی ھاشم بن القاسم قال حدثنا عبد الرحمان بن ثابت قال حدثنا حسان بن عطیۃ عن ابی منیب الجرشی عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من تشبہ بقوم فھو منھم۔ (ابوداؤد) "عثمان بن ابی شیبہ نے حدیث بیان کی ان سے ابو النضر ہاشم بن القاسم نے بیان کی ان سے حسان بن عطیہ نے انہوں نے ابو منیب جرشی سے سنا انہوں نے حضرت ابن عمرؓ سے سنا انہوں نے کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص

نے کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کی وہ اس قوم میں سے ہوگیا۔"

امام ابن تیمیہ نے اس حدیث کے رجال کے متعلق لکھا ہے:

"ابن ابی شیبہ، ابوالنضر، حسان بن عطیہ بخاری و مسلم کے ان مشاہیر اور اجلہ رواۃ میں سے ہیں کہ ان کی ثقہ عدالت ہرگز اس قول کی محتاج نہیں کہ وہ صحیحین کے رجال میں سے ہیں بلکہ صحیحین کے رجال کی جماعت اس لیے ایک سنہری لڑی ہے کہ ان جیسے ثقہ حضرات اس زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ عبدالرحمان بن ثابت ان رواۃ میں سے ہیں کہ یحییٰ بن معین، ابوزرعہ اور احمد بن عبدالرشید جیسے ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ لیس بہ باس (ان کے بارے میں کوئی جرح و خلجان نہیں ہے) اور عبدالرحمان بن ابراہیم نے فرمایا کہ وہ ثقہ ہے۔ ابوحاتم جیسے امام نے فرمایا کہ وہ مستقیم الحدیث ہے۔ ابومنیب جرشی بھی ان صدوق رواۃ میں سے ہیں جن کے متعلق احمد بن عبداللہ الجعفی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں، میں نہیں جانتا کہ کسی نے برائی سے ان کا ذکر کیا ہو۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ حسان اور ابومنیب میں انقطاع ہے اور سماع ثابت نہیں۔ حسان بن عطیہ کا ابی منیب سے سماع ثابت ہے اور امام احمد وغیرہ نے اس حدیث کو حجت سمجھا اور اس سے احتجاج کیا ہے۔" (اقتضاء الصراط المستقیم ص ۳۹)

اس حدیث کو اور بھی بہت سے محدثین نے نقل کیا ہے مثلاً طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں عبداللہ بن عمرؓ سے اور بزار نے حذیفہؓ و ابوہریرہؓ سے۔ ابونعیم نے تاریخ اصبہان میں انسؓ سے اور حاکم نے مستدرک میں ابن عمر سے۔

تشبہ شبہ سے ماخوذ ہے اور شبہ کے معنی ہیں دو چیزوں کا آپس میں ایسا ملتبس ہوجانا کہ کوئی بھی اپنے اصلی وجود کو نمایاں نہ رکھ سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے کچھ امتیازی نشانات یا خصائص ہوں اور ان میں سے ایک اپنے امتیازات چھوڑ کر دوسرے کے امتیازات اپنالے۔ ان امتیازی خصائص کو شریعت کی اصطلاح میں شعائر اور سوشیالوجی کی اصطلاح میں " ETHOS " کہا جاتا ہے۔ کوئی قوم یا سوسائٹی اس وقت تک قوم یا سوسائٹی نہیں کہلا سکتی جب تک کہ وہ مخصوص و مستقل شعائر " ETHOS " کی حامل نہ ہو اور شعائر کی پائیداری و استقلال ہی ایک مذہب و ملت کے پائیدار اور مستقل ہونے کی ضمانت ہے ورنہ وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام نے اسی حکمت کو مدنظر رکھتے ہوئے پوری انسانی زندگی میں مسلمانوں کو دیگر مذاہب و اقوام کے لوگوں سے ممتاز کردیا حتیٰ کہ کفار یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ ما یدع ھٰذا الرجل شیئًا

الا خالفنا فیہ" یہ شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی چیز بھی ایسی چھوڑنا نہیں چاہتے کہ اُس میں ہمارا خلاف نہ کرے"۔ اور مسلمان اس قابل ہوگئے کہ معاش و معاد کے ہر شعبہ میں جمیع کفار کے شعائر سے ممتاز و مختلف شعائر اختیار کر سکیں اور اللہ کے اس حکم کی تعمیل کر سکیں کہ یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا "اے ایمان والو تم کفار کی مثل ہرگز نہ ہونا"۔ اس آیت میں کافروں کی مماثلت و تشبیہ سے روکا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ کفر نہ کرو یا کافر نہ ہو بلکہ کافروں کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے سے روکا گیا ہے۔

اسلام کے علاوہ ہر مذہب کی بنیاد کفر پر ہے اور ہر کفر کے اپنے امتیازی شعائر ہیں۔ اسلام دوسرے مذاہب کو دعوت دینے کی اہلیت صرف اس صورت میں رکھ سکتا ہے اگر اس میں ہر کفر کے شعائر کے مقابلے میں اپنے مستقل اور لازوال شعائر قائم رکھنے کی ہمہ گیر صلاحیت موجود ہو تاکہ وہ دنیا کی ساری قومیتوں کو مٹا کر اپنے اندر جذب کرے اور سب کو اپنے ہی مخصوص رنگ میں رنگ دے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف معاد کی اصلاح کی بلکہ معاش اور تمدن کے بھی نمونے قائم فرمائے اور کوئی خلق و عمل، صورت و سیرت اور عادت و عبادت ایسی نہیں چھوڑی جس کے متعلق اُمت کو ہدایت کی روشنی نہ دی ہو۔

اسلام کے تمام شعبوں عادات، عبادات، حدود و کفارات، معاملات و سیاسیات، تدابیر تمدن طُرقِ تہذیب، سُبلِ اخلاق، آدابِ معاشرت، اصولِ طعام، قوانینِ خواب و بیداری اور تمام وہ کیفیات جو ایک انسان پر خلوت و جلوت، انفراد و اجتماع، نفسی و آفاقی، مادی و روحانی طور پر آسکتی ہیں، ان کے ہر ہر پہلو میں امتیازی خصائص برقرار رکھ سکنے کی شریعت میں صلاحیت موجود ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ہر عہد اور ہر سوسائٹی میں دیگر مذاہب و اقوام کے بالمقابل اپنے شعائر قائم کرنا عین ممکن اور قابل عمل ہے۔ ورنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دوسری اقوام سے ترکِ تشبّہ اور ان کے شعائر اختیار نہ کرنے کا حکم دینا بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

الاصل فی الاشیاء اباحۃ | یہ فقہ کا ایک مشہور کلیہ ہے کہ تمام اشیا بنیادی اور اصولی طور پر جائز ہیں اور جب تک کسی چیز کی حلت یا حرمت کے بارے میں کوئی خاص حکم شریعت میں موجود نہ ہو وہ مباح تصور کی جاتی ہے۔ قاضی شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں اس قاعدہ کی تائید میں آیت "ھو الذی خلق لکم ما

فی الارض جمیعاً سے استدلال بھی کیا ہے۔

وفیہ دلیل علی ان الاصل فی الاشیاء المخلوقۃ الاباحۃ حتی یقوم دلیل یدل علی النقل عن ھذا الاصل۔ (فتح القدیر ج ۴ ص ۶۰)

"اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزیں بنیادی طور پر مباح ہیں اور اس اصول سے کسی چیز کو مستثنیٰ قرار دینے کے لیے دلیل درکار ہوگی۔"

مولانا محمد تقی امینی صاحب اس قاعدے کا سہارا لے کر دوسرے اباحیین کی طرح اس بات کے مدعی ہیں کہ شریعت نے جس چیز کو ناجائز نہیں کیا وہ جائز ہی تصور ہوگی۔ یعنی جائز ہونے کے لیے شریعت سے دلیل طلب کرنا ضروری نہیں۔ حالانکہ جس طرح کسی امر کے ممنوع ہونے کے لیے دلیل شرعی درکار ہے اسی طرح اس کے جائز ہونے کے لیے بھی دلیل شرعی کی ضرورت ہے۔ اتنی بات تو اصول فقہ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جس طرح منفی افعال میں حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی وغیرہ مراتب قائم کرنے کے لیے دلیل شرعی ضروری ہوتی ہے اسی طرح مثبت افعال میں فرض، واجب، مستحسن اور مباح کے مراتب بھی دلیل شرعی کے مطابق قائم ہوتے ہیں۔

دراصل یہ لوگ افعال اور اشیاء میں امتیاز نہیں کر سکے اور انہوں نے دونوں کو باہم ملتبس کر دیا ہے۔ اشیاء میں تو اصل اباحت ہی ہے۔ کسی فعل سے متعلقہ اشیاء تمام کی تمام جائز متصور ہوں گی جب تک کہ شریعت اُن میں سے کسی کو مقید یا ناجائز نہ کر دے۔ مثلاً قربانی کا فعل سرانجام دینے کے لیے ہر مینڈھا جائز سمجھا جائے گا۔ سوائے اس کے جو ایک خاص عمر سے کم ہو وغیرہ وغیرہ۔ جس قدر آیات و احادیث سے اباحیین استدلال کرتے ہیں وہ تمام تر صرف اشیاء کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں، افعال کی اباحت پر نہیں۔ قاضی شوکانی نے بھی تصریح کی ہے کہ اس آیت میں اشیاء مخلوقہ کی اباحت واضح ہوتی ہے۔

جہاں تک افعال کا تعلق ہے اُس میں کسی فعل کو مباح کہنے کے لیے دلیل شرعی ضروری ہے۔ دلیل کے بغیر کسی فعل کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی لیے فقہائے اصولیین متفق ہیں کہ افعال یا امور میں اصل حرمت ہے یا توقف نہ کہ اباحت۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حدیث بیان کرتے ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الامور ثلاثۃ امر بیّن رشدہ فاتبعہ وامر بیّن غیّہ فاجتنبہ، وامر اختلف فیہ فکلہ الی اللہ عز وجل (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱)

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کام تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ کہ اس کا ہدایت ہونا واضح

ہو تو اس کی اتباع کرو اور دوسرا وہ کام ہے کہ اس کی گمراہی ظاہر ہو تو اس سے اجتناب کرو اور تیسرا وہ جس میں اشتباہ واقع ہو تو اُس کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو۔"

علامہ طیبی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

وما لم يثبت حكمه بالشرع فلا تقل فيه شيئاً وفوّض امرهٔ الى الله "جس چیز کا حکم شرع سے ثابت نہ ہو اس میں تم کچھ بھی نہ کہو اور اس کو تم اللہ کے سپرد کر دو۔"

شاہ عبدالحق محدث دہلوی اس کی تشریح کرتے ہیں:۔

پس بسپارہ او را بخدا و توقف کن در آں۔" اس کو خدا کے حوالے کر دو اور اس کے بارے میں کوئی رائے نہ دو۔"

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کچھ اُمور ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں شریعت کا حکم موجود نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ ایک انسان کے لیے ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ شریعت کا حکم واضح طور پر نہ جانتا ہو تو اُس کو اس وقت تک رائے زنی نہیں کرنی چاہیے جب تک اس پر اس بات کا حکم صحیح طور پر واضح نہ ہو جائے۔

حضرت ابوثعلبہ الخشنیؓ کی روایت کو بھی اباحیین بڑے شد و مد سے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کے تمام طُرق اگر سامنے رکھے جائیں تو وہ بھی اشیاء سے متعلق ہے نہ کہ افعال و امور کے متعلق۔ حافظ ابن رجب نے جامع العلوم والحکم میں الحدیث الثلاثون کے تحت اس کے جملہ طرق جمع کر دیے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان الله فرض فرائض فلا تضيعوها وحرم حرمات فلا تنتهكوها وحد حدوداً فلا تعتدوها وسكت عن اشياء من غير نسيان فلا تبحثوا عنها حديث حسن رواه الدارقطنى وغيره۔ هذا الحديث من رواية مكحول عن ابى ثعلبة الخشنى وله علتان احدهما ان مكحولاً لم يصح سماع له عن ابى ثعلبة كذلك قال ابو شهر الدمشقى وابو نعيم الحافظ وغيرهما والثانية انه اختلف فى رفعه ووقفه على ابى ثعلبة وقد روى معنى هذا الحديث مرفوعاً من وجوه اخر۔ (جامع العلوم والحكم ص ۱۹۸)

"اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض متعین کیے ہیں ان کو ضائع نہ کرو اور کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کا ارتکاب نہ کرو اور کچھ حدود مقرر کیے ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں (اشیاء نہ کہ افعال) سے اللہ تعالیٰ

نے بغیر نسیان کے خاموشی اختیار کی ہے ان سے بحث نہ کرو۔ یہ حدیث حسن ہے اسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اس میں دو نقائص بھی ہیں ایک یہ کہ مکحول کا ابو ثعلبہ سے سماع ثابت نہیں ہے جیسا کہ ابو شہر دمشقی اور حافظ ابو نعیم وغیرہ نے کہا ہے۔ دوسرے اس کے مرفوع اور ابو ثعلبہ پر موقوف ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ البتہ اس حدیث کا مفہوم دوسرے طریقوں سے مرفوعاً بھی روایت ہوا ہے۔"

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن رجب لکھتے ہیں:۔

وقوله فلا تبحثوا عنها يحتمل اختصاص هذا النهى بزمن النبى صلى الله عليه وسلم لان كثرة البحث والسوال عن مالم يذكر قد يكون سببًا لنزول التشديد فيه بايجاب اوتحريم وحديث سعد بن ابى وقاص يدل على هذا۔

اور آپ کا یہ فرمانا کہ ایسی چیزوں (مسکوت عنہا) کے بارے میں بحث نہ کرو زمانۂ نبوی سے مخصوص ہے کیونکہ بحث و سوال کی کثرت دین میں سختی کا سبب بن سکتی تھی کہ اس طرح کئی باتیں حرام یا واجب ہو جاتی ہیں اور سعد بن ابی وقاصؓ کی حدیث اس کی دلیل ہے"۔ (ایضاً صفحہ ۲۰۵)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

ومما يدخل فى النهى عن التعمق والبحث عنه امور الغيب الخبرية التى امرنا بالايمان بها ولم يبين كيفيتها۔ وبعضها قد لا يكون له شاهد فى هذا العالم المحسوس فالبحث عن كيفية ذلك هو مما لا يعنى وهو مما ينهى عنه وقد يوجب الحيرة والشك ويرتقى الى التكذيب۔ (ایضاً ص ۲۰۵)

"اور جن پر بحث و تحمیص سے منع کیا گیا ہے ان میں وہ باتیں بھی شامل ہیں جو امور الغیب سے تعلق رکھتی ہیں اور جن پر ایمان لانے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے مگر ان کی کیفیت بیان نہیں کی گئی کیوں کہ اس محسوسات کے عالم میں ان کی نظیر نہ ہونے کی وجہ سے ان پر بحث بے معنی ہے اس لیے اس سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس طرح آدمی حیرت اور شک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور نوبت انکار تک پہنچ جاتی ہے"۔

اصول فقہ اور فقہ کی کتابوں پر نظر ڈالنے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ افعال میں اصل حرمت یا توقف (خاموشی) ہے نہ کہ اباحت۔ بعض مصنفین نے افعال کی جگہ اشیاء اور امور کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں لیکن سیاق و سباق سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں ان کی مراد افعال ہے وہاں وہ اصل حرمت یا توقف ہی کے

قائل ہیں۔ امام علاؤ الدین الحصکفی لکھتے ہیں:۔

علی ماھو المنصوص من ان الاصل فی الاشیاء التوقف - (در مختار ج ۱ ص ۲۰) یعنی صحیح مسلک یہی ہے کہ اشیاء میں اصل توقف ہے ۔طوالع الانوار میں درمختار کے اس مقالے کی یوں تشریح کی گئی ہے:۔

علی ماھو المنصوص ای المؤید بالادلة القویة من ان الاصل فی الاشیاء التوقف فلا یعرف اباحة المباح الا بقوله وفعله علیه الصلاة والسلام -

"جس مسلک کی تائید قوی دلائل سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اصل اشیاء میں توقف ہے ۔مباح کی اباحت بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کے سوا معلوم نہیں ہو سکتی"

طحطاوی نے شرح درمختار میں بھی اس موقع پر یہی لکھا ہے ۔اور تحلیقات شرح منار میں ہے:۔

قال اصحابنا الاصل فیھا التوقف ھذا اصح شئ عندی فی ھذا الباب لان التوقف اصل التقوی فی الامر المسکوت عنه وھو مذھب ابی بکر وعمر وعثمان واشباھھم من الصحابة والصحیح ان الاصل فی الافعال التحریم وھو مذھب علیؓ وائمة اھل البیت ومذھب الکوفیین منھم ابو حنیفةؒ -

"ہمارے اصحاب فرماتے ہیں کہ اشیاء میں اصل توقف ہے اور اس باب میں میرے نزدیک صحیح ترین قول یہی ہے کیونکہ جس چیز کے بارے میں شریعت کی طرف سے سکوت ہو اس میں توقف ہی اصل تقویٰ ہے اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اور ان جیسے دیگر جلیل القدر صحابہ کرام کا یہی مذہب ہے ۔اور صحیح بات یہ ہے کہ افعال میں اصل حرمت ہے اور یہی حضرت علیؓ اور ائمہ اہل بیت اور اہل کوفہ کا مسلک ہے اور یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے"

شیخ احمد ملا جیون لکھتے ہیں:

ان الاصل فی الاشیاء الاباحة کما ھو مذھب طائفه بخلاف الجمھور فان عندھم الاصل ھو الحرمة وعند الشافعیؒ الاصل ھو الحرمة فی کل حال (تفسیر احمدی ص ۶) "ایک گروہ کا مسلک ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے ۔جمہور اس کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اصل حرمت ہے اور امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ اصل بہر حال حرمت ہے"۔

ملا محب اللہ بہاری لکھتے ہیں:۔

الاباحة حکم شرعی لانه خطاب الشرع تخییراً (مسلم الثبوت ص ۴۵) "اباحت حکم شرعی ہے کیونکہ اباحت شرع کا خطاب ہے جس میں کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے"

امام غزالی لکھتے ہیں:۔

وحد المباح انه الذی ورد الاذن من اللہ تعالیٰ بفعله وترکه۔ (المستصفی ج ۱ ص ۶۶) "مباح کی تعریف یہ ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے کرنے اور چھوڑنے کا اذن دیا گیا ہو"

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:۔

ان عبارات سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ کسی امر کی اباحت بھی ایک شرعی حکم ہے اور وہ کتاب وسنت کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی۔ یہ مسلک کہ اباحت ویسے ہی فرض کر لینے میں انسان آزاد ہے اور اس میں کسی دلیل شرعی کی حاجت وضرورت نہیں ایک مختصر گروہ کا خیال ہے۔ جمہور اس کے خلاف ہیں اور امام حصکفی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے:

الصحیح من مذهب اهل السنة ان الاصل فی الاشیاء التوقف والاباحة رای المعتزلة

"اہل سنت وجماعت کا صحیح مذہب یہ ہے کہ اشیاء میں اصل توقف ہے اور اباحت کا قول معتزلہ کی رائے ہے"

اور جن محققین نے اس بارے میں اختلاف بھی کیا ہے وہ اختلاف بھی شریعت کے ورود سے قبل کے متعلق ہے، کیونکہ شریعت کے نازل ہونے کے بعد اس اختلاف کی گنجائش ہی نہیں کہ اصل اباحت ہے یا حرمت؟ کیونکہ شریعت کاملہ نے ہر معاملہ کی حدود وقیود متعین کر دی ہیں اور خود بینی و آزادہ روی کا دروازہ ہی بند کر دیا ہے۔

علامہ عبدالعلی بحر العلوم میں فرماتے ہیں

یظهر من تتبع کلامهم ان الخلاف قبل ورود الشرع ...... فاذاً لیس الخلاف الا فی زمان الفترة التی اندرست فیه الشریعة بتقصیر من قبلهم وحاصله ان الذین جاءوا بعد اندراس الشریعة وجهل الاحکام فاما جهلهم هذا یکون عذراً فیعامل

مع الافعال کلھا معاملۃ المباح اعنی لا یواخذ بالفعل ولا بالترک کما فی المباح وذھب الیہ اکثر الحنفیۃ والشافعیۃ الی ان قال وانما ھذا ای القول بالاباحۃ الاصلیۃ بناء علی زمان الفترۃ قبل شریعتنا یعنی اذ لا اباحۃ حقیقۃ بل بمعنی نفی الحرج ولعل المراد من الافعال ماعدا الکفر ونحوہ فان حرمتھا فی کل شرع بین ظھور اً تاماً۔ (فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ج ۱ ص ۴۹)۔

"اس تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اختلاف زمانۂ فترۃ (قبل از ورودِ شریعت) کے بارے میں ہے جس میں پہلے لوگوں کی کوتاہی کی وجہ سے شریعت مٹ چکی تھی اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جو شریعت کے مٹ جانے کے بعد آئے اور احکام سے ان کو واقفیت نہ رہی تو ان کا جہل عذر تصور ہوگا اور سب افعال کے ساتھ مباح کا معاملہ کیا جائے گا یعنی نہ فعل پر ان کا مواخذہ ہوگا اور نہ ترک پر جیسا کہ مباح کا حکم ہے، اور یہی اکثر حنفیہ اور شافعیہ کا مسلک ہے۔ اور یہ بات یعنی اباحت اصلیہ کا قول ہماری شریعت سے قبل زمانۂ فترۃ پر محمول ہے اور اباحت بھی بایں معنی کہ حرج کوئی نہ ہوگا اور شاید کہ مراد افعال سے کفر وغیرہ ہے، کیونکہ کفر وغیرہ کی حرمت ہر ایک شریعت میں واضح اور غیرمبہم طور پر بیان کی گئی ہے"۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ نفوس میں اصل خطر ہے اور اموال میں اصل اباحت ہے۔ حالانکہ جس طرح اللہ نے ایک مومن سے جنت کے عوض اس کے اموال خرید لیے ہیں اسی طرح نفوس بھی خرید لیے ہیں: ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ (اللہ نے مومنین سے جنت کے عوض ان کے نفوس اور اموال خرید لیے ہیں)۔ اپنی جان اور مال اللہ کے ہاتھ بیچ دینے کے بعد مومنین کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اپنی جان اور مال میں اللہ کی مرضی کے مطابق تصرف کرے نہ کہ اپنی مرضی سے۔

اس موضوع پر بھی امام ابن تیمیہ کی بات حرفِ آخر ہے کہ اصل اباحت ہے یا حرمت۔ جب کتاب و سنت کی موجودگی میں ایک کامل شریعت اور جامع ہدایت موجود ہو تو یہ کہنا کہ اصل حرمت ہے یا اباحت بالکل فضول ہو جاتا ہے۔ اصل کتاب و سنت ہے باقی سب گمراہی ہے۔ ان کے قول پر ہی ہم اس فصل کا خاتمہ کرتے ہیں:۔

ولکن الدلیل الجامع ھو الاعتصام بالکتاب والسنۃ فان اللہ عزوجل بعث محمداً صلی اللہ علیہ وسلم بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ وقد قال تعالیٰ الیوم

اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا وقال تعالیٰ ان هذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیله - قال عبد اللہ بن مسعودؓ خط لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطاً وخط خطوطاً عن یمینه وشماله ثم قال هذا سبیل اللہ وهذا سبل علی کل سبیل منها شیطان یدعوا الیه ثم قرأ (وان هذا صراطی مستقیما) - (الرسالة فی السماع والرقص ص ۱۲۴)

"لیکن دلیل جامع اعتصام بالکتاب والسنۃ ہے کیونکہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا ہے تاکہ دوسرے تمام ادیان پر غالب آجائیں اور اللہ نے کہا کہ آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا اور پھر کہا کہ یہ میرا راستہ ہی سیدھا ہے اس پر چلو اس کے علاوہ اور کوئی راستہ اختیار نہ کرو ایسا کرنا تمہیں اصل رستہ سے ہٹا دے گا۔ نیز حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپ نے ہمیں سمجھانے کے لیے ایک لکیر کھینچی اور پھر اس کی دائیں اور بائیں جانب لکیریں کھینچیں پھر فرمایا یہ اللہ کا رستہ ہے اور باقی تمام رستے شیطان کے ہیں جن کی جانب وہ بلاتا ہے پھر یہ آیت پڑھی (وان هذا صراطی مستقیما)۔"

داعئِ حق کی اخلاقی تربیت کا معیار

سیّد اسعد گیلانی صاحب

ایک داعی جو حق کی طرف دعوت دے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف ہی دعوت دیتا ہے، اس لیے کہ اِس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اِس کا ایک خالق، مالک، آقا اور پروردگار ہے، اور وہی اِس کا مستحق ہے کہ اُس کی بندگی اور پرستش کی جائے، اور اُس کی مخلوق کا اُس کے ساتھ سب سے زیادہ سچا اور حقیقی تعلق بھی یہی ہے کہ وہ اپنے مالک اور خالق کی بندگی و عبادت کرے۔ اِس بات کو خالق و مالک نے خود بیان کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ — میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی اور عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

بالفاظ دیگر یہ مخلوق کے بہت سے کاموں میں سے ایک کام نہیں ہے، بلکہ یہی ایک کام اس کی پیدائش کا حقیقی مقصد ہے۔ اور انسانی کارناموں میں سے اصل اور برحق کارنامہ اگر کوئی ہے تو یہ کہ دنیا کے لوگوں کو مالک کے آگے جھک جانے اور اس کی بندگی بجالانے کی دعوت دی جائے۔

بندگیٔ رب کی دعوت دینے والا دنیا والوں میں سب سے زیادہ محترم معزز اور مقدس گروہ انبیاء کا گروہ تھا جس کے افراد اپنے اپنے دور اور اپنی اپنی قوموں میں مسلسل اور پیہم آتے رہے اور ایک ہی بات کی طرف سارے انسانوں کو بار بار دعوت دیتے رہے۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ — "اے برادرانِ قوم اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"

اسی طرح انبیاء علیہم السلام، جو نوعِ انسانی کے سب سے زیادہ معزز، معتبر، محترم، اور مقدس افراد

تھے، اُن کے کام کا مرکزی نقطہ ہمیشہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی بندگی کی طرف بلانا رہا ہے۔ اور یہی دعوت انبیاء کے ساتھی اور ان کے راستے پر چلنے والے تمام صالحین بھی اپنے اپنے وقت میں دیتے رہے ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی نظر میں انسانیت کی ہدایت رہنمائی اور بھلائی کے لیے سب سے مقدم کام یہی ہے کہ اس کے بندوں کو اُس کی بندگی کی طرف بلایا جائے۔ سائنٹفک دریافتیں، مشینوں کی ایجاد، انسانی سہولتوں میں اضافے کے کام، محتاج اور پریشان حال انسانوں کی مدد، تعلیمی اور رفاعی ادارے، امن کی سلامتی اور لوگوں کی بہبود کے سارے کام، دعوتِ دین کے اس کام کے آگے ہیچ پست اور دوسرے درجے کے کام ہیں۔ خدا کی نظر میں سب سے اعلیٰ وارفع اور دنیا و آخرت میں انسانیت کی بھلائی اور بہبود کا عظیم ترین کام خدا کی بندگی کی طرف خدا کے بندوں کو دعوت دینا ہے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ بہترین صلاحیت کے لوگ اس کام کا بیڑا اٹھا کر ہمہ تن اس میں لگ جائیں اور دینی و دُنیا کے مختلف کاموں میں مصروف لوگ خدا کے اس کام میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں اور اپنا فریضۂ بندگی بجا لائیں۔

لیکن جس طرح ہر کام کے لیے ایک خاص صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اللہ کے بندوں تک اللہ کی بندگی کی دعوت پہنچانے کے لیے بھی ایک مخصوص صلاحیت اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انبیاء کی تربیت تو اللہ تعالیٰ براہ راست خود کرتا رہا ہے۔ کبھی انفس وآفاق میں آیاتِ الٰہی دکھا کر، کبھی فرعون کے گھر میں پال کر اور بھیڑ بکریاں چَروا کر، کبھی کنویں اور جیل کے راستے سے تختِ شاہی تک پہنچا کر، اور کبھی غار و ہجرت کے مراحل طے کرا کے غلبۂ نظامِ اسلامی تک پہنچا کر۔ لیکن انبیاء کے بعد جس کسی کو بھی دعوتِ حق کا کام کرنا ہو اسے ایک خاص نوعیت کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ایک مخصوص طرز کی تربیت کی ضرورت ہے۔ یہ تربیت علمی بھی ہوگی اور عملی بھی۔ اس کے بغیر دعوتِ دین کا کام احسن طریقے سے سرانجام دینا ممکن نہیں ہے۔

داعیٔ حق کی علمی تربیت

کوئی شخص جب تک یہی نہ جانتا ہو کہ حق کیا ہے، اس کا معیار کیا ہے، اس کی شناخت اور اس کی پہچان کیا ہے، اس کے خدوخال اور اس کا حدود اربعہ کیا ہے، وہ کس چیز سے منع کرتا ہے اور کون سا کام کرنے کا حکم دیتا ہے، اُس وقت تک اُس کے لیے نہ خود یہ یقین کرنا ممکن ہے کہ وہ حق پر ہے اور نہ دوسروں کو باور کرانا ممکن ہے کہ وہ حق ہی پیش کر رہا ہے، حق کے نام پر کوئی اور چیز پیش نہیں کر رہا ہے۔ اس لیے دعوتِ دین کے لیے حق جوئی، حق شناسی، حق آگاہی، اور حق پرستی، ساری صفات ضروری ہیں۔ اس کے بعد جو شخص

دعوتِ دین کا یہ کام کرنا چاہے اُسے مندرجہ ذیل اقدامات لازماً کرنے ہوں گے۔

۱- احساس و شعور کی بیداری ایک داعیٔ حق میں پہلے ہی قدم پر یہ احساس و شعور پیدا ہونا انتہائی ضروری ہے کہ وہ جس دین کی دعوت لے کر اٹھ رہا ہے، اس کی اپنی زندگی بھی اس سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں۔ جہاں جہاں بھی وہ اپنا بے لاگ جائزہ لے کر کوتاہی محسوس کرے اُسے دُور کرنا چاہیے۔ یہ اس سے اس کے دین کا سب سے پہلا تقاضا ہے۔ اگر وہ دین کے اس مطالبے کو پورا کرنے سے عاری ہے تو جس جس پہلو سے وہ اس کا مطالبہ پورا نہیں کرتا اسی پہلو سے اس کی دعوت کا مخاطب بھی اس کی دعوت کی طرف سے غیر متاثر بے نیاز اور بے پرواہ رہتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کو حق کی ترازو میں تولے اور ہر کسر کو پورا کرنے کی اپنی سی کوشش کرے۔ اپنی طرف دیکھنا، اپنی ذات پر خود گرفت کرنا اور اپنی ذات کو لاکر اپنے ضمیر کے سامنے کھڑا کرنا اور ضمیر کی کسوٹی پہ پرکھنا دعوتِ حق کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص جہاد پر جانے سے پہلے اپنی ہمت و طاقت اور اپنے اسلحہ کی جانچ پڑتال کرے۔ غرض اس کام کے لیے ایک باشعور اور بیدار ضمیر مطلوب ہے اور بیدار ضمیر کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی نیکی پر خوش ہوتا اور اپنی بدی پر آزردہ اور نادم ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا اپنی بہن فاطمہؓ سے مار پیٹ کا واقعہ ان کے اندر احساس و شعور کی کروٹ کا واقعہ تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی کمزور بہن جو کبھی ان کی کسی بات کے سامنے اف نہیں کرتی تھی ایک خالص دینی معاملہ میں ان کے سامنے ڈٹ گئی اور یہ تک کہہ گزری کہ "عمرؓ جو چاہے کر لو لیکن اب اسلام دل سے نہیں نکالا جا سکتا"۔ تو ان کی بہن کا یہ پُرعزیمت جملہ اور ناقابلِ شکست رویہ ان کے اندر احساسِ خیر کی بیداری کا باعث بن گیا۔ عمرؓ بن خطاب کے اندر عمر فاروقؓ نے کروٹ لی اور انھوں نے محسوس کیا کہ کوئی خاص چیز ضرور ہے جس نے اُن کی بہن کو اتنا قوی کر دیا ہے کہ وہ اب اپنے بھائی کی پرواکرنے سے بھی بے نیاز ہے۔ اپنی بہن کی یہی جرأت آمیز بات ان کے اندر قبولِ حق کے لیے چنگاری کا کام کر گئی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص حضورؐ اکرم کے ارشاد کے مطابق اپنے پانچ نکاتی جائزے کا اہتمام کرے کہ وہ اپنی عمرِ عزیز کس کام میں صرف کر رہا ہے، اپنا علم کس مقصد کے لیے کام میں لا رہا ہے، اپنی آمدنی کو کہاں کہاں سے حاصل کر رہا ہے اور اسے کس کس راستے میں صرف کر رہا ہے؟ اُس کی جسمانی اور ذہنی توانائیاں کس کس جگہ کام آ رہی ہیں، اور یہ کہ ان سب چیزوں میں ان کے خدا کا حصہ کتنا ہے تو یہ جائزہ ہی اس کے اندر اخلاصِ نیت، خشیتِ الٰہی اور دین کے لیے کام کرنے کا عزم پیدا کر دے گا اور وہ دینِ حق کے داعی و مبلغ کی حیثیت سے کام کرنے کی خوبی سے آراستہ ہو جائے گا۔

۲۔ نیت کی درستی شعور و احساس کی بیداری کے بعد دوسرا مسئلہ اللہ کے دین کے لیے کام کرنے کی نیت اور عزم کا ہے۔ جب تک آدمی صدقِ دل سے نیت کر کے خدا کے کام کی طرف رجوع نہ کرے اس کے خیالات اور ارادے اور اس کی توانائیاں سمت منزل اور ہدف سے محروم رہتی ہیں۔ اسلام میں نیتِ خیر کا مسئلہ عملِ خیر سے پہلے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نیت کی خوبی عملِ خیر کو تقویت پہنچاتی ہے، اس میں خلوص اور بے لوثی پیدا کرتی ہے، اس کے کام کو بہتر انجام تک پہنچاتی ہے، اور انسان میں عزم، حوصلہ اور صبر پیدا کرتی ہے۔ نیت کے بغیر کوئی نیکی بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے ایک مومن کو یہ طے کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اللہ کی بندگی کی دعوت اللہ کے بندوں تک پہنچانا چاہتا ہے اور اس کے اللہ کا اس کے ذمہ یہ حق ہے جسے ادا کیے بغیر اس کا فریضۂ بندگی ادا نہیں ہوتا۔ یہ وہ اجتماعی کام ہے جسے سرانجام دیے بغیر نیکی میں بھی استحکام اور استقلال پیدا نہیں ہوتا۔ ایک داعیِ حق میں یکسوئی کے ساتھ یہ جذبہ بھی شدید ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مالک کے دین کی دعوت اس کے تمام بے خبر اور گم کردہ راہ بندوں تک پہنچائے گا اور اس میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور قوتیں بہترین انداز میں کھپائے گا۔ اس راستے میں آنے والی مشکلات سے ہرگز نہیں گھبرائے گا۔ اس لیے کہ مشکلات تو حق کے راستے کا زادِ راہ ہیں۔ مصائب اس راستے کا توشہ ہیں اور مخالفتیں اس راستے کا دستور ہیں۔ عزمی داعیِ حق کی پہچان یہی ہے کہ وہ حق و صداقت کا پیغام لے کر خدا کے بندوں کی طرف جاتا ہے اور اگر ان کی طرف سے مزاحمت و مخالفت گالی گلوچ مارپیٹ اور پتھر بھی برسیں تو ان سب کو برداشت کرتا ہوا نتائج کو اپنے مالک کے حوالے کر دیتا ہے اور اس کام سے کسی رکاوٹ کے سبب بھی کبھی باز نہیں آتا۔

۳۔ علمِ حق و صداقت کا حصول علمِ حق و صداقت دینِ اسلام ہے اور اس کے حصول کے دو سرچشمے ہیں: قرآن اور سنت۔ انسانوں کے مالک کی مرضی قرآن سے معلوم ہوتی ہے اور اس مرضی کو پورا کرنے کا طریقہ قرآن کے لانے والے رسول اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے سمجھ میں آتا ہے۔ ہمارا مالک ہم سے کیا چاہتا ہے اور کس طرح چاہتا ہے، یہ بات ہمیں قرآن اور رسول پاکؐ کی تعلیمات کو جانے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ایک داعیِ حق کے لیے قرآن سے تعلق جوڑے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ ایک ہی واحد کتابِ صداقت و ہدایت ہے اور اب ساری ہدایت اسی کے اندر ہے اس سے باہر کوئی ہدایت و صداقت نہیں ہے جو شخص ہدایت کا متلاشی اور صداقت کی پیروی کرنا چاہتا ہے وہ اس کتاب سے استفادہ کیے بغیر راہِ حق نہیں پا سکتا۔ زمین پر خدائے بزرگ و برتر کی یہ ایک ہی آواز ہے جس کی پکار پر قدم بڑھائے بغیر انسان فلاح کا راستہ نہیں پا سکتا۔ اس لیے قرآن کا پڑھنا اس

کے مضامین کو سمجھنا اور اس کی ہدایات کو زیادہ علم رکھنے والوں کی مدد سے اپنے اندر جذب کرنا، اسے حفظ کرنا اسے اپنے سینے میں محفوظ کرنا اور اس کے سانچے میں ڈھل جانے کی کوشش کرنا نہایت ضروری ہے۔ پھر اس قرآن کو لانے والے پاک اور معصوم انسان کے نقوشِ قدم پر چلنے کی سعی کرنا ہے اس لیے کہ وہی خدا کے مطلوبہ معیار کے کامل نمونے اور مکمل انسان ہیں اور جو شخص بھی خدا کی مرضی کو انسانی کردار میں منعکس دیکھنا چاہتا ہو وہ رسول پاک کے کردار اور اخلاق ہی میں دیکھ سکتا ہے اور جس کسی کو حق بولتے ہوئے اپنے کانوں سے سننا ہو وہ حضور اکرمؐ کے ارشادات کو سن سکتا ہے۔ غرض حق و صداقت کا سرچشمہ قرآن و سنت ہی ہیں۔

۴۔ مطالعہ سیرت صحابہ و صالحین | خدا کے احکام اور رسول اکرمؐ کے کامل نمونے کو انسان جس بہترین انسانی سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھ سکتا ہے وہ صحابۂ کرامؓ اور سلف صالحین ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے کردار ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ جنھوں نے اپنی زندگیاں دعوتِ دین اور اشاعتِ حق کے لیے صرف کر دیں۔ جو صداقت کے پیکر، ہدایت یافتہ اور نیکی کے علمبردار تھے۔ جن کے کردار سے معروف نمایاں ہوتا اور منکر دبتا ہے۔ جن کے خصائل کے آئینے میں ہمیں معروف کے اہتمام اور منکر سے اجتناب کی بہترین مثال ملتی ہے۔ جو حق کے لیے جہاد کرنے والے، حق کے لیے گھر بار چھوڑنے والے، حق کے لیے زندگیاں کھپانے والے اور حق کے لیے اپنی زندگیوں کی ساری ادی متاع لگا دینے والے تھے۔ جن کے عمل سے ہمیں بھلائی کے راستے پر چلنے کے لیے رہنمائی ملتی ہے اور جن کے کام سے ہمیں اپنے کام میں مدد ملتی ہے۔ جنھوں نے حق ہم تک پہنچایا تو وہ ہم تک پہنچا اور جنھوں نے معروف و منکر کے فرق کو اپنے کردار سے عیاں کیا تو وہ ہم پر عیاں ہوا۔ ان کی خدا ترسی، خشیت الٰہی، حالات کی خوبی، عبادات کا انہماک، کردار کی بلندی، اللہ اور رسولؐ سے وفاداری، اور دین کے لیے قربانی و ایثار سے ہمارے سامنے درخشاں مثالیں قائم ہوتی ہیں اور جن کے نقشِ قدم پر چل کر ہم نقشِ ہدایت پاتے ہیں۔ ایک مدعیِ حق کے لیے ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرنا اور ان کی زندگیوں کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنانا بے حد ضروری ہے۔

۵۔ تعلق باللہ | ایک داعیِ حق کے لیے سب سے مضبوط لنگر اپنے مالک کے ساتھ اس کا گہرا، جاندار، پائیدار اور مضبوط تعلق ہے۔ اس کا یہ احساس کہ وہ جس کا کام کر رہا ہے وہ اس کو دیکھ رہا ہے، اس کے فرشتے اس کی مدد کر رہے ہیں، اس کی پشت پناہی اسے حاصل ہے، وہ زندہ و پائندہ، حی و قیوم، قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہستی کا کارندہ اور اس سے وابستہ ہے۔ وہ ہستی قدم قدم پر اس کی دست گیری کرتی ہے۔ وہ فرد فرد کے دل میں اس کی پذیرائی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ وہ کھلے اور چھپے اندھیرے اور اجالے میں اس کی

نگران، محافظ اور پشت پناہ ہے۔ جس کی قدرت کاملہ سے باہر کوئی پر بھی نہیں ہلا سکتا۔ وہ اس کی زیر لب دعاؤں کو بھی سنتا ہے، اس کے دل کے اضطراب کو بھی جانتا ہے۔ وہ ہستی اس کے ساتھ ہے جس پر ایمان لانا ہر ایمان سے مقدم ہے۔ جس سے خوف کھانا ہر خوف سے مقدم ہے۔ جس کی رضا چاہنا دوسرے ہر کسی کی رضا سے مقدم ہے۔ جس کی عبادت میں انہماک دوسرے ہر انہماک سے مقدم ہے۔ جس سے گہرا تعلق ہر دوسرے تعلق سے مقدم ہے۔ وہی ہر دعوت کا مرکز، ہر دوڑ دھوپ کا محور، اور ہر ایثار و قربانی کا مقصود ہے، اس کی رضا کا حصول ہمارا سرمایۂ زندگی ہے اور اس کی رضا کے لیے ہمارا سب کچھ حاضر اور قربان ہے۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

غرض داعی حق میں یہ توانائی ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے ہر محبت قربان کر سکے اور اس کی خاطر ہر غصہ برداشت کر سکے۔ اس کے لیے ہر نقصان گوارا کرے اور اس کی خاطر ہر نفع ترک کر دے۔ جو اس کے دشمن ہیں وہ ان کا دشمن ہو جائے اور جو اس کے دوست ہیں وہ ان کا خادم بن جائے۔ اس طرح مالک کی صفات کے ایک ایک پہلو پر غور و فکر کر کے اس سے محبت بھی کرے اور اس سے خوف بھی کھائے۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی کے مقابلے میں آگ میں گر جانا اسے قبول ہو اور اس کا ذکر اسے ہر ذکر سے محبوب ہو۔ اس کی بندگی کے لیے وہ نماز پڑھے۔ اس کو خوش رکھنے کے لیے وہ روزہ رکھے اور اس کی رضا کے لیے وہ اس کی راہ میں خرچ کرے۔ بس اپنے مالک کے ساتھ جب اس کا تعلق درست ہو جائے تو پھر داعی حق کے روحانی کردار کی بنیاد مضبوط ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے ضروری تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔

۶۔ محبتِ رسولؐ | اللہ کے بعد دوسری ہستی جس سے ایک داعی حق کے لیے بے پناہ محبت جزو ایمان ہے، وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے جنھوں نے انسانیت کو دوزخ کے گڑھے سے بچا کر جنت کے راستے پر ڈالا۔ جنھوں نے انسانوں کو تباہی سے ہٹا کر سلامتی کی طرف رہنمائی کی۔ جنھوں نے مصائب اٹھا کر ہمارے لیے ایمان و اسلام اور رضائے الٰہی کے حصول کے مواقع پیدا کیے۔ جنھوں نے ہجرت اختیار کر کے ہمارے لیے کفر سے ایمان کی طرف آنے کا راستہ ہموار کیا۔ جنھوں نے کفر سے ٹکرا کر حق و باطل کا امتیاز نمایاں کیا۔ جو انسانیت کے قافلہ سالار اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ جو قیامت تک کے لیے قافلہ انسانیت کے مستقل رہنما اور قائد برحق ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو تہذیب کا درس دیا۔ اس کو وحشت و درندگی سے شرافت و مدنیت کا سبق دیا۔ جہالت کے اندھیرے سے علم کی روشنی کی طرف رہنمائی کی۔ جنہوں نے ہمیں بہترین قانونِ عدل عطا فرمایا۔ انسانی مساوات دی۔ آقا و غلام کا فرق مٹایا۔ عورت کو بلند درجہ دے کر اُسے مرد کا ساتھی اور رفیق بنایا اور ماں کے پاؤں کے نیچے جنت کا نشان بنایا۔ جنہوں نے چھوٹوں کو بڑوں کا ادب سکھایا اور بڑوں کو چھوٹوں پر مہربانی اور شفقت کی تعلیم دی۔ جن سے بڑھ کر رحیم و کریم انسان نہ ان سے پہلے دنیا میں آیا اور نہ ان کے بعد آئے گا۔ جو سراپا رحمت، سراپا محبت و شفقت، اور مظلوموں یتیموں مسکینوں اور پس ماندہ انسانیت کے محافظ و سرپرست تھے۔ ہمارا ان سے محبت کرنا صرف اعترافِ احسان ہی نہیں بلکہ جزوِ ایمان بھی ہے اور جس دل میں ان کی محبت نہیں ہے اس میں ایمان کی رمق بھی موجود نہیں ہے۔ ایک داعیِ حق کے لیے ان کی محبت مشعلِ راہ اور ان کی پیروی عزیمت و استقامت کا معیار ہے۔ یہی بات تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا تھا کہ اے عمرؓ جب تک میں تمہارے لیے تمہاری اپنی جان سے عزیز نہ ہو جاؤں تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔

۷۔ فکرِ آخرت: خدا اور رسولؐ کی محبت کے ساتھ ہی فکرِ آخرت بھی مومن کا جزوِ ایمان ہے۔ آخرت کو ترجیح دینا اور دنیا کے مقابلے میں آخرت کو سنوارنے کی کوشش کرنا داعیِ حق کا فرضِ اولین ہے۔ وہ دنیا میں مگن لوگوں کو آخرت کی یاد دلاتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ حقیقی اور کامل زندگی آخرت کی ہے۔ دنیا اس کے مقابلے میں یوں ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں شبنم ہوتی ہے۔ دنیا تو اچھے اور بُرے دونوں قسم کے لوگوں کی مخلوط آبادی ہے۔ لیکن آخرت میں جا کر دونوں کی آبادیاں الگ الگ ہو جانے والی ہیں۔ بُروں کے لیے دوزخ کی آبادی ہوگی اور وہ بڑی ہی ہولناک آبادی ہے۔ اور اچھوں کے لیے جنت ہوگی اور وہ بڑی ہی خوشگوار اور دل خوش کن آبادی ہے۔ آخرت میں جا کر دُنیا کی ساری آبادی ان دو آبادیوں میں تقسیم ہو جائے گی اور تقسیمِ آبادی کا اصول دنیا کی زندگی کا عمل ہوگا۔ کسی شخص نے دنیا میں کس طرح زندگی گزاری؟ خدا کا وفادار بندہ بن کر یا باغی اور سرکش انسان بن کر؟ اس کی زندگی اطاعت کی زندگی تھی یا بغاوت کی زندگی؟ یہی وہ فیصلہ کن سوال ہے جس پر آخرت کی کامیابی و ناکامی کا مدار ہے۔ دنیا میں اسی بات کا امتحان ہے کہ ایک شخص اپنے حقیقی مالک کو پہچانتا اور اس کی اطاعت کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ یہ کام دنیا میں ہی ممکن ہے۔ یہاں مالکِ حقیقی کی ذات آیات و علامات کے پردے میں پنہاں ہے اور اس کی طرف چلنے میں مصائب بھی آتے ہیں اور اس کی طرف جانے

میں شیطان کے خوشنما جال بھی رکاوٹ بنتے ہیں۔ آخرت کا احساس تو صرف ضمیر کرتا ہے اور دنیا کی شیرینیوں کا احساس انسان کا ظاہری رونگٹا رونگٹا کرتا ہے۔ یوں انسان کو امتحان میں ڈالا گیا ہے اور ایک داعیٔ حق کا کام یہ ہے کہ وہ حقیقت کو پہچانے اور راہ راست پر خود بھی چلے اور دوسروں کو بھی اس راستے پر چلنے کی دعوت دے۔

آخرت کے احساس کی پرورش کے مختلف اور متعدد ذرائع ہیں جن میں سب سے اہم ذریعہ قرآن مجید کی آیاتِ اِنذار اور مناظرِ قیامت کا مطالعہ ہے۔ پھر احادیث میں کتاب الرقاق اور کتاب الفتن کا مطالعہ ہے۔ پھر بزرگوں کے احساس آخرت کو بیدار کرنے والے واقعات و احوال ہیں۔ پھر گاہے بگاہے گورِ غریباں میں جا کر آخرت کے مسافروں کے آخری نشانات قبروں کے درمیان کچھ وقت گزارنا ہے۔ پھر کبھی کبھی ہسپتال میں جا کر بیماروں سے ملاقاتیں اور ان کے حالات سے آگاہی ہے۔ اِسی طرح ایک داعیٔ حق آخرت کی فکر رکھنے والوں کے درمیان رہ کر فکرِ آخرت کا احساس زیادہ سے زیادہ پیدا کر سکتا ہے۔

داعیٔ حق کے کردار کا ایک قرآنی خاکہ

ہر مومن بنیادی طور پر تین شخصیتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وہ مسلم ہوتا ہے کہ زندگی کے سارے ہی معاملات میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطیع فرمان بن کر رہتا ہے۔ وہ مبلغ ہوتا ہے کہ دینِ حق کو بخیل کی طرح چھپا کر نہیں رکھتا بلکہ ساری انسانیت کے سامنے اس راہ ہدایت کو احسن طریقے پر پیش کرتا ہے۔ وہ سپاہی اور مجاہد ہوتا ہے اور ہر کام کو مستعدی اور چستی اور لگن سے کرتا ہے اور کسی کام میں بھی تساہل نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اس کا تبلیغ دین کا عمل ایک مسلسل اور پیہم جہادِ اکبر ہے۔ حضورؐ نے غزوہ تبوک سے واپسی پر مدینہ کی طرف سفر کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ سے فرمایا تھا کہ ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس لیے کہ نفس کو اللہ کا مطیع فرمان بنا کر رکھنا اور اسے اللہ کی رضا کا تابع کرنا بہت بڑا جہاد ہے اور جہاد ہی مومن کی ساری زندگی کا شعار ہے۔

چنانچہ ایک مسلم، مبلغ اور مجاہد یعنی داعیٔ حق کی انفرادی زندگی کا جو نقشہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں جابجا پیش کیا ہے چند مقامات سے اس کی ایک ہلکی سی جھلک پیشِ خدمت کی جاتی ہے۔ سورۂ الفرقان میں مالک الملک نے اپنے خاص بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ رحمان کے اصلی بندے تو وہ ہیں جو:۔

يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا ۔ وہ زمین پر نرم چال چلتے ہیں۔

إِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُونَ قَالُوا سَلٰمًا ۔ جاہل ان کے منہ آئیں تو سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں۔

يَبِيتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا - اپنے رب کے لیے سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔
إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا - خرچ میں نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں - بس دونوں کے درمیان اعتدال رکھتے ہیں۔
لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ - خدا کے سوا کسی اور کو معبود بنا کر نہیں پکارتے۔
لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ - کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے۔
لَا يَزْنُوْنَ - زنا نہیں کرتے۔
لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ - جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے۔
إِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا - لغو چیز پر گزر ہو تو شریفانہ گزر جاتے ہیں۔

پھر سورۂ المومنون میں ان کی علامات یہ بتائیں:۔

هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ - اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔
هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ - زکوٰۃ پر عامل ہوتے ہیں۔
هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ - اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔
هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ - اپنی امانتوں اور اپنے عہدوپیمان کا پاس کرتے ہیں۔

پھر سورۂ لقمان میں بتایا:۔

لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ - لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر۔
لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا - زمین میں اکڑ کر نہ چل۔
وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ - اپنی چال معتدل رکھ اور اپنی آواز پست رکھ۔

پھر سورۂ توبہ میں مزید خدوخال نمایاں کیے:۔

اَلتَّآئِبُوْنَ - توبہ کرنے والے۔
اَلْعٰبِدُوْنَ - عبادت کرنے والے۔
اَلْحٰمِدُوْنَ - خدا کی حمد کرنے والے۔
اَلسَّآئِحُوْنَ - خدا کی راہ میں سفر کرنے والے۔
اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ - رکوع و سجود کرنے والے۔

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے۔
اَلْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔ حدودِ الٰہی کی حفاظت کرنے والے۔

غرض اس طرح قرآن و حدیث کے صفحات میں جابجا داعی حق مومن کے کردار کی حسین و جمیل جھلکیاں بکھری ہوئی ہیں جنہیں آسانی سے چُن چُن کر داعیٔ دعوت حق کے خوشنما کردار کا ایک عمدہ گلدستہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

داعی حق کی عملی تربیت ایک داعی حق صرف الفاظ کے طوطا مینا بنانے کے لیے نہیں اٹھتا بلکہ وہ انسانی زندگیوں میں خوشگوار اصلاحی انقلاب برپا کرنے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ اس لیے اس کا حقیقی میدان عمل کا میدان ہے۔ وہ انسانی زندگیوں کی کھیتی میں اپنی اصلاح کے بیج بوتا ہے اور خوشگوار اخلاق و کردار کی فصل اُگاتا ہے۔ اس کے ذریعے انسانیت عملی طور پر فلاح کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ وہ کوئی راہب نہیں ہوتا کہ خاموشی سے گوشہ نشینی کا راستہ اختیار کرے۔ وہ کوئی جوگی نہیں ہوتا کہ کسی پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ کر شانتی کو تلاش کرتا ہے۔ وہ کوئی تارک الدنیا فقیر و درویش نہیں ہوتا کہ جس دنیا میں اس کے خدا نے اُسے امتحان کی خاطر اُتارا ہے، اس امتحان گاہ سے خاموشی کے ساتھ کھسک کر ایک کونے میں جا لگے اور وہاں ساری زندگی گذار دے۔ وہ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مخاطب ہوتا ہے کہ:۔

"تم میں جو کوئی بدی دیکھے تو لازم ہے کہ اُس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے، اور اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ہی سہی۔ اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل میں اس کو بُرا سمجھے اور اُس کو مٹانے کی خواہش رکھے کیونکہ یہ ایمان کا کم از کم درجہ ہے۔ جس دل میں بدی کے خلاف یہ نفرت بھی نہ ہو اس میں رائی بھر بھی ایمان نہیں۔"

اسی لیے قرآن نے صاف صاف حکم دیا ہے کہ:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ	"تم میں سے ایک ایسی جماعت تو ضرور ہی ہونی چاہیے
اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	جو نیکی کی طرف بلاتی ہو۔ اچھے کام کا حکم دیتی
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ	ہو اور بُرے کام سے روکتی ہو اور فلاح پانے
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران)	والے یہی لوگ ہیں۔

یہ ہدایات ایک داعی حق کو واضح طور پر میدان عمل میں کام کرنے کا حکم دیتی ہیں۔

۱۔ اصلاح خلق کی عملی جدوجہد ایک داعیٔ حق کی تربیت کا پہلا عملی ذریعہ یہ ہے کہ وہ اس کام کو سرانجام دے جس کو وہ حق سمجھتا ہے۔ درحقیقت وہ اس وقت تک اپنی دعوت کے فطری نتائج سے دوچار نہیں ہوتا جب تک وہ میدان میں آکر بندگانِ خدا کے سامنے عملی طور پر دعوتِ حق پیش نہ کرے۔ اس اقدام کے ساتھ ہی اس سے تعاون کرنے والے دوستی کے ہاتھ بھی ہوں گے جو اس کے رفیق ہوں گے، اور مزاحمت کرنے والے ظالم ہاتھوں سے بھی واسطہ پڑے گا جو اس کا راستہ روکیں گے۔ یوں عملی جدوجہد کے ساتھ ہی اُسے رفاقت کے لطف اور مزاحمت کی اذیت سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہی دونوں احوال اس کی تربیت کے لیے کافی ہوں گے۔ دوستوں سے مل کر وہ کام کا نقشہ بناسکے گا اور مخالفوں کی مزاحمتوں کے توڑ کی تدبیر سوچے گا اور ان کے مظالم پر صبر کی مشق کرے گا۔ اس طرح اس کے اندر عزم وارادہ پرورش پائے گا اور آزمائش کی بھٹی سے گزر کر وہ سونا ہو جائے گا۔

اس جدوجہد میں اس کے قریبی عزیز اور ہمدرد بھی اس کا راستہ روکیں گے تاکہ وہ اپنے دنیوی مستقبل کو خراب نہ کرے، اور اس کے مخالف بھی اس کا راستہ روکیں گے تاکہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو۔ یہ صورتِ حال اس کی تربیت کے لیے ماحول کا ایک عمدہ تربیتی سانچہ فراہم کردے گی جس میں ڈھل کر وہ ایک کامیاب داعیٔ حق بن جائے گا۔

۲۔ صحبت صالح داعیٔ حق کی تربیت کا دوسرا عملی ذریعہ صحبت صالح ہے۔ اسے بُرے لوگوں کی صحبت و رفاقت اور محبت والفت سے دست کش ہو کر اچھے، خدا ترس اور نیک لوگوں کی محبت و ہم نشینی اختیار کرلینی چاہیے تاکہ اس پر باطل کی ہم نشینی کے ناگوار اثرات نہ پڑیں اور اس کو باطل باتوں اور لغو حرکات کو برداشت کرنے کی عادت نہ پڑ جائے اور اس میں مداہنت پرورش نہ پائے۔ وہ ہم خیال اور نیک لوگوں کی مجلس سے خود بھی مستفید ہوگا اور ان کو بھی حق کی پشت پناہی پر آمادہ کرسکے گا۔ اگر ایک نمازی آدمی بے نماز لوگوں کی مستقل رفاقت اختیار کرلے تو وہ ضرور ہی آہستہ آہستہ نمازوں میں کوتاہی کا شکار ہوتا چلا جائے گا اور اس کے ہم نشین اس کے لیے نماز قائم کرنے میں مددگار ہونے کے بجائے کوتاہی کرنے کا باعث بنتے چلے جائیں گے۔ اس لیے ایک داعیٔ حق کی اخلاقی تربیت کا ذریعہ نیک لوگوں کی مجلس و رفاقت ہے نہ کہ بُروں کی ہم نشینی۔ اور جب نیکی ایک جماعت کی صورت اختیار کرکے کام کرتی ہے اس صورت میں وہ زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ویسے بھی اسلام نے مسلمان کو نیکی کا حکم دینے والوں کی ایک جماعت بن کر کام کرنے کا

حکم دیا ہے۔ جس طرح کوئلوں کے پاس بیٹھنے والا سیاہی سے نہیں بچ سکتا اور پھولوں کے درمیان بیٹھنے والا ان کی خوشبو اپنے لباس میں سمیٹ لیتا ہے اسی طرح انسان پر صحبتِ نیک و بد کا اثر ہوتا ہے۔ نیک لوگوں کے اجتماعات میں شرکت نیکی کرنے کا ذریعہ اور نیکی کی دعوت پھیلانے کا باعث بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ نیک لوگ باہم ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔ اس طرح اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ باہمی اصلاح کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ اور اگر کوئی ان میں سے گرتا نظر آتا ہے تو دوسرا اُسے سنبھالتا ہے۔ ایک کے پائے استقامت میں اگر لغزش آتی ہے تو دوسرا آگے بڑھ کر اُسے تھام لیتا ہے۔ ایک کے دامن کا دھبہ دوسرا صاف کر دیتا ہے اور اگر دوسرے کا دامن آلودہ ہو رہا ہو تو وہ اسے پاک کر دیتا ہے۔ ایک کی فلاح دوسرے کی رہنمائی کا باعث بنتی ہے اور ایک اگر اپنی عاقبت سنوارنے کا اہتمام کرتا ہے تو دوسرا اس کی مدد کرتا ہے۔ اگر ایک کی کوئی بات دل کو کھٹکتی ہے تو دوسرا احسن و خوبی کے ساتھ اس کی توجہ دلا دیتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ پورا اجتماع باہمی خیر و خوبی کا تبادلہ کر کے حسن و خوبی کا مرقع بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ایک داعی حق کسی صحابی یا بزرگ کو اپنا آئیڈیل بنا کر اس کی خوبیوں کو اپنے اندر پرورش کرنے کا اہتمام کرے تو اس سے بھی تربیت اور کردار کی اصلاح میں بڑی مدد ملتی ہے۔

۳۔ اپنے سے بہتر لوگوں پر نظر تربیت و اصلاح کردار کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے احباب و رفقا میں جو شخص اخلاق و کردار اور دینداری اور تقویٰ میں اپنے سے بہتر ہو اس پر نظر رکھی جائے اور اس کی خوبیاں اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک داعیِ حق کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ دنیوی اُمور میں اپنے سے کم تر کی طرف دیکھے تاکہ ان نعمتوں اور بھلائیوں پر اللہ کا شکر ادا کر سکے جو اُس نے دوسروں سے زیادہ اُسے عطا کی ہیں اور دینی اُمور میں اپنے سے بہتر کی طرف دیکھے تاکہ اپنی کوتاہیوں کا احساس کرے اور اپنے اخلاق و کردار کا اس سے موازنہ کر کے نیکی کے راستے میں آگے بڑھ سکے۔ دوسروں کی خوبیوں کو اپنائے اور اپنے آپ کو سنوارنے کی تگ و دو کرے۔ اگر انسان غور سے دیکھے تو صاف دکھائی دے گا کہ اس کے چاروں طرف اس کے مختلف ساتھیوں میں اخلاق و کردار کے عمدہ عمدہ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ کسی میں خدا ترسی ہے، کسی میں خوش خلقی ہے، کسی میں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے اور انفاق فی سبیل اللہ کرنے کا جذبہ ہے۔ کسی میں عبادت کا شغف ہے۔ کوئی ذکر و اذکار میں منہمک ہے۔ کوئی خلقِ خدا کی ہمدردی، خیر خواہی اور خدمتِ خلق میں آگے ہے۔ کوئی شفقت، نرم دلی، خوش خلقی، اور خوش مزاجی میں منفرد ہے۔ کوئی راتوں کا تہجد گزار

ہے اور کوئی دن کا مجاہد فی سبیل اللہ اور دعوتِ حق کی راہ میں سرگرم و سبک رفتار ہے۔ ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آس پاس بکھری ہوئی اُن خوبیوں کو سمیٹ سمیٹ کر اپنے کردار میں جمع کرتا جائے تاکہ وہ خود بھی ان ساری خوبیوں کا ایک دلآویز گلدستہ بن جائے۔

۴۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام | داعیِ حق کی تربیت کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے کہ وہ خلق خدا کے اندر بالفعل نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے اور اس کام میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اور کسی خوف دلانے والے کے خوف سے نہ دبے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو۔ بدی سے روکو اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو اور اُسے حق کی طرف موڑ دو۔ ورنہ اللہ تمہارے دل کی بُرائیاں ایک دوسرے پر مسلط کر دے گا یا تم پر اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح اس نے بنی اسرائیل پر کی"۔ ترمذی

اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ مسلمانوں میں خیر کی شمع کو روشن رکھنے اور شر کی ظلمت کو دفع کرنے کا اہتمام جاری رہنا اشد ضروری ہے۔ اگر یہ کام نہ کیا جائے تو پھر ایسے لوگوں کا اللہ کے عذاب سے بچ نکلنا سخت مشکل ہے۔

۵۔ معاشرہ۔ تربیت و اصلاح کا سانچہ | جب کوئی شخص دعوتِ حق لے کر اُٹھتا ہے تو صرف یہی نہیں ہوتا کہ تنہا وہی معاشرے کی اصلاح کا کام کرتا ہے بلکہ خود معاشرہ بھی اس کے اندر معمولی سے معمولی کمزوری اور لغزش کی نشاندہی کر کے اُسے ٹھیک ٹھیک اصلاح و درستی کے معیارِ مطلوب پر قائم ہونے اور قائم رہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایک داعیِ حق اس بات کی طرف معاشرے کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جس بات کا وہ خود اہتمام نہ کرتا ہو اور اُس خرابی سے وہ کسی دوسرے کو بچا نہیں سکتا جس خرابی سے وہ خود بچنے کا اہتمام نہ کر رہا ہو۔ اسی طرح جونہی وہ اپنی دعوت لے کر اُٹھتا ہے ہر طرف سے خوردبینیں اس کے ایک ایک کام اور اس کی ایک ایک حرکت پر لگ جاتی ہیں اور اگر اس میں ذرا بھی ٹیڑھ ہو تو اُسے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی داعی کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ بہت سی خرابیاں اپنے اندر لے کر معاشرے کی اصلاح کے لیے نکل کھڑا ہو۔ معاشرہ اس کے قول و فعل کو یکسو کر کے چھوڑتا ہے۔ یا تو اُسے اپنے قول کے مطابق خود ہی ڈھلنا پڑتا ہے یا پھر اسے اپنے قول سے ہی باز آ جانا پڑتا ہے۔ اس لیے انسانی معاشرہ دعوتِ حق پیش کرنے والے کے لیے خود بھی ایک محتسب بن کر اس کی درستی اور راستی کا

ضامن بن جاتا ہے۔ کبھی معاشرے کی تنقید سے اور کبھی اس کی مزاحمت اور آزمائش سے داعیٔ حق اپنے کردار کی ہر کجی کو دُور کر دیتا ہے اور بالآخر وہ اپنی دعوت کے لیے مخلص اور بے لوث ہو کر رہتا ہے۔ اس طرح داعیٔ حق کے لیے معاشرہ خود ایک تربیتی ماحول اور اصلاح کا سانچہ فراہم کر دیتا ہے۔

۶۔ **نظامِ حق کے غلبہ کی جدوجہد**: تمام ذرائع تربیت میں داعیٔ حق کی اخلاقی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ وہ اُس نظامِ حق کے غلبہ کے لیے عملی طور پر جدوجہد کا آغاز کرے جس کی حقانیت کی گواہی وہ اپنے قول و فعل سے دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حق کے علمبردار کی اخلاقی تربیت کے بھی مختلف مدارج ہیں، جس طرح حدیث کی رُو سے ایمان کے مختلف درجے ہیں۔ اگر منکر کو قوت سے روکنا ایمان کا پہلا درجہ ہے تو منکر کو روکنے والی قوت کی فراہمی یعنی اقامتِ دین کی جدوجہد بھی ایک داعیٔ حق کا پہلا اور مقدم فرض ہے جس سے پہلو تہی کر کے اس کے دوسرے اعمال کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے۔ جب تک یہ نیت نہ ہو کہ خدا کا کلمہ بلند کرنا ہے اور جب تک پیشِ نظر یہ منزل نہ ہو کہ دینِ حق کو ساری دنیا میں غالب کرنا ہے اس وقت تک ایک داعیٔ حق کی سیرت کا پورا پورا ظہور نہیں ہوتا اور اس کے سارے گوشے نکھر کر سیرت کی تکمیل نہیں ہوتی۔

بلاشبہ یہ ضروری ہے کہ ایک داعیٔ حق میں ایمان کے سارے پہلو اور سارے مدارج موجود ہوں اور وہ اس کا اہتمام کرے۔ جس طرح خدا پر ایمان، رسولوں پر ایمان، آخرت پر ایمان، اور ایمان کے دیگر تمام گوشوں کو ہمہ پہلو مکمل کیے بغیر ایمان کے حقیقی تقاضے پورے نہیں ہوتے اسی طرح زبانی ایمان کا اعتراف ہی کافی نہیں بلکہ اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ و رسول کا مطیع فرمان بنا دینا اور ان کے احکام پر سر جھکا کر بلا چوں و چرا چل پڑنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ ورنہ ایمان بلا عمل تو نفاق کا مظہر بن جاتا ہے۔ ایمان کے تقاضوں کے مطابق عمل کا نام ہی حقیقی اسلام ہے۔ یعنی عملی اطاعت کا زندگی کے ہر ہر گوشے میں مظاہرہ کرنا ہی سچا اسلام ہے۔ پھر یہ مظاہرۂ اطاعت بھی ایسا ہو کہ جس میں احساس و شعور و ضابطہ و تقاضائے حکم کا پورا پورا التزام و اہتمام موجود ہو۔ جس میں خدا کا خوف صاف صاف جھلکتا ہوا دکھائی دے۔ جس میں رسول اکرمؐ کی محبت نمایاں طور پر موجود ہو۔ جس میں مومن اپنے پورے احساس ذمہ داری سے دینِ حق کی پیروی کا اہتمام کرے اور پورے طور پر تابع فرمانِ الٰہی ہو جائے۔ جو حکم وہاں سے ملے اس پر چل پڑے۔ جس چیز سے روک دیا جائے اس سے رُک جائے۔ اور اس میں اس کی اپنی خواہش اور مرضی کا دخل نہ رہے بلکہ وہ پورے طور پر خدا اور رسولؐ کی مرضی کا تابع ہو جائے۔

پھر اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ ضابطہ کے مطابق مرضیِ الٰہی کا تابع ہو جائے۔ بلکہ اس میں اپنے مالک کے احکام اور اپنے آقا کے ارشادات کے ساتھ ایسا والہانہ لگاؤ پیدا ہو جائے کہ ان کے خلاف وہ کوئی دوسرا راستہ سوچ بھی نہ سکے۔ اس میں احکامِ الٰہی پر چلنے کے لیے والہانہ پن پیدا ہو جائے۔ جب تک اس کے مالک کا کلمہ بلند نہ ہو اس کے دل میں ایک لگن اور اس کے دماغ میں ایک ہر وقت اضطراب موجود رہے۔ وہ خدا کے دشمنوں کے خلاف مسلسل اور پیہم تبلیغ و تلقین سے لے کر جان و مال کی قربانی تک ہمہ تن جدوجہد میں مشغول رہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر اس میں داعیٔ حق کی وہ صفات نمودار ہوتی ہیں جو اس راستے میں مطلوب ہیں۔ پھر وہ کسی کے ابھارنے اور اکسانے کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ خود کار مشین کی طرح اپنے مالک کے راستے پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کا وجود اللہ کی آیات میں سے ایک آیت بن جاتا ہے۔

کیا خوب کہا تھا ایک بزرگ نے کہ:۔

"جب میں اپنے مالک کی اطاعت سے ذرا بھی انحراف کرتا ہوں تو اس کا اثر اپنے بیٹے کی گستاخی، اپنی بیوی کی غفلت، اور اپنی سواری کی سرکشی میں صاف دیکھ لیتا ہوں"

بلاشبہ تبلیغِ دین ایک انسان سازی کا پُر حکمت کام ہے اور اس میں بھونڈے طریقے سے کام نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ انسانی نفسیات کا لحاظ کیے بغیر صرف جبر و تشدد، طعن و تشنیع اور ملامت و نصیحت سے ٹیڑھے دلوں کو سیدھا کرنا چاہتے ہیں وہ بالعموم دلوں کو توڑ دیتے ہیں لیکن انہیں سیدھا نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ دل کا دروازہ اندر کی طرف ہے اور اسے جب تک گھر کا مکین خود اندر سے نہ کھولے باہر کے کسی جبر سے اُسے کھولا نہیں جا سکتا۔ تبلیغ کا کام حکمت کا کام ہے اس کام کو احسن طریقہ سے ہی انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	اللہ کے راستے کی طرف، حکمت اور عمدہ نصیحت کے
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ	ساتھ دعوت دو اور بحث مباحثہ بھی احسن طریقہ
بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۔	سے کرو۔

البتہ ایک داعیٔ حق کے لیے یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے کہ انسانوں کی تربیت کو بگاڑنے والی اور تبلیغ کی تاثیر کو خراب کرنے والی کونسی چیزیں ہیں۔ اگرچہ وہ بہت سی باتیں ہیں لیکن ان میں بے صبری سب سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ جلد بازی اس سے بھی زیادہ مضر ہے۔ اور سخت کلامی، درشت مزاجی،

اور تشددِ بیان تو سب سے زیادہ مہلک ہے۔ اسی طرح اسے یہ بھی جاننا چاہیے کہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو دعوت دین سے بے نیاز اور لاپروا ہوتے ہیں اور بالعموم حق کی علمبرداری کے لیے آگے بڑھنے کے لیے نہ تیار ہوتے ہیں اور نہ اس کی ضرورت کے قائل ہوتے ہیں۔ دنیا کی محبت میں اندھے لوگ، اقتدار کے نشے میں سرشار لوگ، مفاد پرستی میں مبتلا لوگ، آرام و راحت کے دلدادہ لوگ، اور خوفِ آخرت سے بے نیاز لوگ، ان میں سرِفہرست ہیں۔ یہ لوگ حق کے کسی کام کے نہیں ہوتے اور داعیٔ حق کے لیے ان کا وجود کسی درجے میں بھی ممد و معاون ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے یہ بھی جاننا چاہیے کہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو انسانی معاشرے میں زیادہ آسانی سے دعوتِ حق کو قبول کر کے اس کے علمبردار بن جانے اور حق کی پشت پناہی کے لیے اپنا سب کچھ لگانے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں وہ سعید الفطرت لوگ جو بات چیت سے ہی راہِ راست قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں، وہ غور و فکر اور سوچ بچار کے عادی لوگ جو ہر بات کی گہرائی تک پہنچنا ضروری سمجھتے ہوں، وہ حساس لوگ جو حوادث سے عبرت پکڑنے والے ہوں، طالبِ حق اور راہِ راست کے متلاشی لوگ، آیاتِ الٰہی پر غور و فکر کرنے والے لوگ، سچ بولنے والے لوگ، راست فکری کے عادی لوگ، باہمت، جری اور بہادر لوگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک داعیٔ حق ان اقسام کے لوگوں میں اپنی دعوت پہنچا کر زیادہ تعداد میں اپنے ساتھی فراہم کرسکتا ہے۔

اگر ان علمی تربیت کے اصولوں کو داخلی اصلاح و تیاری کے لیے اور عملی تربیت کے اصولوں کو خارجی تربیت و اصلاح کے لیے استعمال کیا جائے اور سامنے ہی بگاڑ کی بیشتر صورتوں سے مکمل اجتناب اور پرہیز بھی کیا جائے تو وہ مناسب اخلاقی اور روحانی تربیت حاصل ہو جاتی ہے جس کی مدد سے دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت اور اقامت و سربلندی کا کام آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ جب تک کوئی شخص یہ صفات اپنے اندر پیدا نہ کرے وہ تبلیغ کے میدان میں نہیں نکل سکتا۔ یہ تو ایک اصولی اور مثالی معیار ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ تبلیغ کے لیے نکلنا ہر مومن کا فرض ہے اور فرض کی ادائیگی کے لیے ہر شخص اُسی صلاحیت کا مکلف ہے جو اُسے حاصل ہو۔ اس کی کوشش کو قبول کرنے والا مالک بیحد رحیم و کریم ہے۔ وہ تو اتنا مہربان ہے کہ اُس کا جو بندہ اُس کی طرف چل کر جاتا ہے تو وہ اس کی طرف دوڑ کر آتا ہے اور جو بندہ اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہے وہ اس کے درجات فرشتوں سے بھی زیادہ بلند و بالا کر دینے والا آقا و مولیٰ ہے اس کی مہربانیوں اور بندہ نوازیوں کا بھلا کون احاطہ کرسکتا ہے۔

(بقیہ اشارات) قصہ ہائے پارینہ بن کر رہ جاتے ہیں جن کی نئے دَور میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی — افسوس ہے کہ اِس گمراہ کُن نظریہ پر کوئی گرفت نہ کی گئی بلکہ حکومت کے نشریاتی اداروں نے اِس نظریہ کی بڑی پذیرائی کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور آپؐ کے بلند مرتبہ و مقام کے بارے میں اِس باطل نظریہ کی اشاعت سے حکومت کی گہری دلچسپی سخت تکلیف دہ ہے خصوصاً جب کہ پاکستان کے عوام اِس بات سے بھی پُوری طرح باخبر ہوں کہ سرکاری ذرائع ابلاغ پر جو لوگ اِس وقت قابض ہیں اُن کی اکثریت دن رات اشتراکیت کے اِس فلسفہ کا پرچار کرتی ہے کہ ہر دَور کا اپنے مخصوص تقاضوں کے تحت اپنا قرآن ہوتا ہے — دُنیا میں کوئی ایک شخصیت بھی ایسی نہیں جس کی زندگی اور اس کی پیش کردہ تعلیمات سے قیامت تک انسانیت رہنمائی حاصل کرتی رہے۔ یہ گمراہ کُن خیالات پہلے تو صرف چند افراد تک محدود تھے لیکن اب چونکہ ان کا دبے لفظوں میں اظہار کبھی کبھی ایوانِ اقتدار سے بھی ہوتا رہتا ہے اس لیے سیرت کانفرنس میں جب انہیں باضابطہ پیش کر کے مُلک اور بیرونِ مُلک نشر کرنے کا التزام کیا گیا تو لوگوں کے ذہنوں میں فطری طور پر یہ خدشات اُبھرنے لگے کہ کہیں ہمارے ملک میں حضورؐ کی محبت اور عقیدت کے نام پر حضورؐ کی رسالت اور آپؐ کی ہدایات کو وقتی تقاضوں سے محدود کرنے کی کوشش تو نہیں کی جا رہی۔

اگر اِس کانفرنس کے منتظمین اور حکومت کے بعض ذمہ دار افراد کی طرف سے پروفیسر واٹ کے اِن خیالات کی تردید ہو جاتی یا کم از کم اِن کی اشاعت کو روک دیا جاتا تو پاکستان کا ایک عام شہری یہ سمجھنے میں کسی حد تک حق بجانب ہوتا کہ یہ ایک غیر مُسلم مُستشرق کے ذاتی خیالات ہیں جن کو کسی طرح بھی حکومت کی تائید حاصل نہیں۔ لیکن عوام کو ایک تو ان خیالات کی اشاعت سے سخت صدمہ ہوا، دوسرے وزیرِ اعظم صاحب نے اس مقدس تقریب کے آخری اجلاس میں جن خیالات کا اظہار فرمایا، خصوصاً اسلام کے ایک نہایت ہی اہم شعار پر دہ کو جس طرح ہدفِ تنقید بنایا اور اُسے ایک رجعت پسندانہ رسم قرار دیتے ہوئے اُس کے خلاف جس انداز اور جس لب و لہجہ میں گفتگو کی اور اپنے اِن غیر اسلامی خیالات کا جس جوش کے ساتھ بلوچستان کی ایک تقریب میں اعادہ کیا اُس سے ان کی اسلام سے محبت اور شیفتگی کے بارے میں کوئی اچھا تأثر قائم نہیں ہوتا اور انسان اس کھلے تضاد پر غور کرنے لگتا ہے جو اُن کی اسلام سے عقیدت مندی کے بلند بانگ دعاوی اور اِن دعاوی کے ثبوت میں سیرت کانفرنس جیسی مقدس تقریب کے انعقاد، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے واجب الاحترام

امامین کے پاکستان میں دوروں کے سرکاری انتظامات اور ان بزرگ ہستیوں کے سامنے کتاب اللہ کے ساتھ نہایت ہی جذباتی انداز سے اپنی محبت کے اظہار اور پھر پردہ کو قید سے تعبیر کر کے عورتوں کو اس سے آزاد ہونے کی ترغیب وتلقین کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ان متضاد باتوں کو دیکھتے ہوئے انسان کے سامنے وہی نقشہ گھومنے لگتا ہے جسے قرآن مجید نے تنبیہ کے طور پر بیان فرمایا ہے:۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا۔

تمہاری حالت اُس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

ماہنامہ　　　　　　　　　　　　　　　　لاہور

سیّارہ

نئے درخشاں دَور کا آغاز

ہ

—— نیا نظام ادارت ——

نعیم صدیقی (صدر مجلس ادارت)

پروفیسر فروغ احمد (مدیر مسئول) ہ فضلُ من اللہ (مدیر انتظامی)

طاہر شادانی ہ پروفیسر حفیظ الرحمٰن احسن

باہتمام :- دار الاشاعت مصنّفین (پاکستان) لاہور

اشاعت خاص

مئی کے اواخر میں

ضخامت :- ۳۰۰ صفحے —— رنگین خوشنما سرورق

قیمت :- ۱۰/- روپے

خرچہ رجسٹری ایک روپیہ - (پیشگی چندہ بھیجنے پر معاف)

ہ

ماہنامہ سیّارہ - ۸ - اے - ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور ۱۲

مطبوعات ادارۂ ترجمان القرآن

★

نئی مطبوعات

★

	روپے
پارہ اول (تفہیم القرآن)	۶/۵۰
سورۃ الفاتحہ و البقرہ	۹/-
سورۃ یٰسٓ	۲/۲۵
سیرت کا پیغام ۵۰/- روپے فی سینکڑہ	
اسلام میں انسانی حقوق ۵/- فی سینکڑہ	

انگلش کتب

THE QUESTION OF DRESS
RS 2/50

FUNDAMENTALS OF ISLAM
SERIES BOOK 1

ESSENCE OF ISLAM
RS 7/00

SERIES BOOK 2
WORSHIP IN ISLAM
RS 5/-

نئے ایڈیشن

★

	روپے
دینیات	۶/-
حقوق الزوجین	۸/-
خلافت و ملوکیت	۱۸/-
حقیقت اسلام (خطبات حصہ اول)	۴/-
حقیقت صوم و صلوٰۃ " دوم	۲/۵۰
حقیقت زکوٰۃ " سوم	۲/-
حقیقت حج " چہارم	۱/۷۵
حقیقت جہاد " پنجم	۱/۲۵
سورۃ الحجرات	۲/۵۰
سورۃ الرحمٰن	۲/۲۵
سورۃ الفتح	۲/۲۵
سورۃ لقمان	۲/-

★

ادارۂ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——۴۱۰۱۶——۴۱۰۱۷